ندوۃ العلماء کے متعلق مولانا کا تخیل اور ان کی ضرورت و اہمیت دکھائی گئی ہے، مجموعی حیثیت سے سب مضامین مفید اور دلچسپ ہیں، شروع میں مولانا کے قلم کی لکھی ہوئی ایک غزل اور غیر مطبوعہ خط کا عکس بھی دیا گیا ہے، جو تقریب کے بانیوں کی درخواست پر دارالمصنفین سے بھیجا گیا تھا۔

صحرا صحرا۔ مرتبہ جناب کبیر احمد صاحب صبا جائسی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۲۶، قیمت عہ/ مجلد، پتہ کتاب گھر، علی گڑھ۔

جناب کبیر احمد صبا جائسی ایک ہونہار ادیب و شاعر ہیں، اُن میں شعر و ادب کا اچھا ذوق ہے، "صحرا صحرا" ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے، مصنف شعر و سخن کے موجودہ ترقی پسندانہ رجحان سے واقف ہیں، لیکن انھوں نے روایتی شاعری سے اپنا تعلق باقی رکھا ہے، انکے جذبات میں بلندی اور خیالات میں پاکیزگی ہے، ان کا صحرا میں آبلہ پائی کا شوق انتہائی میں دامن تر اور گرد سفر کا سہارا اور شورش و یلغار میں آگے بڑھنے کا حوصلہ قابل داد ہے، یہ صبا صاحب کا پہلا مجموعہ ہے، اس لیے ابھی ان کے بعض اشعار میں ابہام و تعقید ہے، نیز بعض الفاظ و ترکیبوں میں سلاست و روانی کی کمی بھی ہے، وہ اصلاً فارسی ادبیات کے طالب علم ہیں، اس مجموعہ کے آخر میں چار پُرکیف فارسی غزلیں بھی ہیں،

مبادی الصرف۔ مرتبہ مولانا ظہیر الدین عثمانی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۷۵، قیمت درج نہیں، پتہ دارالمعارف، دیوبند،

مصنف نے مبتدیوں کی عربی تعلیم کے لیے ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتابچہ اس کا پہلا حصہ ہے، اس میں بہترین پیرایہ اور اچھے انداز میں صرفی مسائل تحریر کیے گئے ہیں، اردو میں صرف و نحو کی جو مفید کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ بھی ان میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔

"ض"

نمبر ۱۰۵۔ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۰ء۔ عدد ۶

مضامین

مقالات

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی نے انتقال فرمایا، موصوف کو حضرت مجدد الف ثانیؒ سے نسبی اور خاندانی تعلق بھی تھا، وہ اس دور کے عارف کامل اور نامور شیخ تھے، ان کی خانقاہ ارشاد و ہدایت کا مرکز تھی، اور اس سے بڑا فیض پہنچا، راقم کو بھی انکی خدمت میں حاضری اور کئی مجلسوں میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، معلوم ہوتا تھا علم و عرفان کا چشمہ ابل رہا ہے اور دلوں کی کھیتیاں سیراب ہو رہی ہیں، میری حاضری کے وقت حضرت کی عمر اسّی سال کے قریب ہی ہوگی، ظاہرۃً بھی نحیف تھے، لیکن روحانی قوت کا یہ حال تھا کہ گھنٹوں پورے جوش کے ساتھ تقریر و ملفوظات کا سلسلہ جاری رہتا تھا، اور یہ روزانہ کا معمول تھا، آپکے ملفوظات و مواعظ علم و عرفان کا گنجینہ ہیں، جہاں تک معلوم ہے ان کو قلم بند کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا، مولانا علی میاں نے کچھ مجلسوں کے ملفوظات قلمبند کئے تھے، جو الفرقان میں شائع ہو چکے ہیں، اگر تمام ملفوظات و مواعظ قلمبند ہو کر شائع ہو گئے ہوتے تو علم و عرفان کا یہ گنجینہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا، ان کی وفات سے ارشاد و ہدایت کی ایک نورانی شمع گل ہو گئی، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔

ندوہ کی اسٹرائک کے متعلق راقم اپنے خیالات اخبارؔ کے ذریعہ ظاہر کر چکا ہے، اور ۷، ار جون کو ندوہ کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہونے والا ہے، اس لیے اب کسی دوسری تحریر کی ضرورت نہ تھی لیکن اس سلسلہ میں چند ضروری باتیں کہنی ہیں، ندوہ کی اسٹرائک کوئی نئی چیز نہیں، مولانا شبلی کے زمانہ میں اس سے بڑی اسٹرائک

ہو چکی ہے، سید صاحب کے زمانہ میں بھی ہوئی تھی، دار العلوم دیوبند جیسا مقدس ادارہ اس وبا سے نہ بچ سکا اس لیے اسٹرائک کی حیثیت سے اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہے، لیکن عربی مدارس کے طلبہ کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی تقلید میں مطالبات منوانے کا یہ طریقہ نہایت نامناسب اور انکی دینی حیثیت سے فروتر ہے، یونیورسٹیوں کے طلبہ کی اکثریت مذہب، اخلاق اور مشرقی آداب و تہذیب سے بالکل آزاد ہوتی ہے، اور عربی کے طلبہ ان کے نمائندے ہوتے ہیں، مگر ان طلبہ کی تقلید میں وہ ساری حرکتیں کرتے ہیں جن کی مذہب کیا معمولی اخلاق و تہذیب بھی اجازت نہیں دیتی جو ان کیلئے انتہائی شرمناک ہے،

طلبہ کو سیاسی اغراض کے لیے استعمال کرنا لیڈروں کا معمول بن گیا ہے، چنانچہ انکی ہر اسٹرائک میں کچھ لوگ انکی حمایت میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور سارا الزام منتظمین کے سر رکھ دیتے ہیں، یہی سیاست بازی ندوہ کی اسٹرائک میں بھی ہوئی اور بیرونی لوگوں نے اس کو زیادہ ہوا دی، اخلاق کا سبق دینا آسان ہے لیکن ان پر عمل ان معلمین اخلاق کے لیے بھی دشوار ہے، اگر ان کو کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر، کسی کالج کا پرنسپل اور کسی امتحان کا نگراں بنا دیا جائے تو ان کو ایسا سبق ملے کہ سارا فلسفۂ اخلاق بھول جائیں، انکی سیاست بازی کے بہت سے میدان ہیں، وہ عربی مدارس پر رحم کریں، اور ان کو اپنی سیاست کا اکھاڑہ نہ بنائیں، اور غیر متعلق بحثوں میں اس مسئلہ کو نہ الجھائیں، البتہ اگر اصلاحی اور تعمیری نقطۂ نظر سے کوئی مفید مشورہ دیں تو وہ قابل غور ہو سکتا ہے۔

اگر طلبہ، مدرسین اور منتظمین اپنے حقوق و فرائض کے حدود کا خیال رکھیں تو عربی مدارس کیلئے اس مسئلہ کا حل دشوار نہیں ہے، طلبہ کا فرض اطاعت و سعادتمندی ہے اور اساتذہ و منتظمین کا شفقت و محبت، اس میں دونوں طرف سے کوتاہی ہوتی ہے، طلبہ کی غلطی یہ ہے کہ وہ حدود کا لحاظ نہیں رکھتے، رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔

اور معمولی معمولی شکایتوں پر جو آسانی سے پوری ہوسکتی ہیں، رائج الوقت نامناسب طریقے اختیار کرتے ہیں، اور منتظمین کی غفلت یہ ہے کہ وہ ان شکایتوں کی طرف اس وقت توجہ کرتے ہیں جب معاملہ حد سے آگے بڑھ جاتا ہے، اگر ابتدا ہی میں جائز شکایتیں دور کردیجائیں تو اس کی نوبت ہی نہ آنے پائے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ طلبہ کا ہر مطالبہ قابلِ قبول نہیں ہوتا، ورنہ نظام ہی قائم نہیں رہ سکتا، ان سب معاملات پر مجلسِ انتظامیہ میں غور کیا جائے گا۔

یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ عراق کے مجتہد اعظم آقائے سید محسن الحکیم کی وفات کی خبر ملی، وہ شیعوں کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا اور علم کے منصب جلیل پر فائز تھے، مذہبی امور میں انکا فیصلہ حرف آخر کا حکم رکھتا تھا، جس کے سامنے پوری شیعی دنیا سر تسلیم خم کرتی تھی، علمی حیثیت سے وہ دنیائے اسلام کے نامور علماء میں تھے اور سنیوں میں بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، انھوں نے اپنے فرقہ کی بڑی مفید علمی و دینی خدمات انجام دی ہیں، اسی کے ساتھ وہ اتحاد اسلامی کے بھی قائل تھے، اور شیعہ سنی اختلاف کو ناپسند کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

سنیوں کے یہاں اس قسم کا کوئی منصب نہیں ہے، جس کو پوری سنی دنیا ماننے پر مجبور ہو، اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں ہر شخص مجتہد ہے، اور جن کو نہ صرف دینی علوم سے کوئی واقفیت نہیں بلکہ مذہب سے بھی عملاً کوئی علاقہ نہیں، ان کو بھی اجتہاد کا دعویٰ ہے، چنانچہ آجکل ایسے بہت سے مجتہد اور مفسر قرآن ملیں گے جو عربی کی ابجد سے بھی واقف نہیں، ان کا کام یہ ہے کہ جو نیا قالب نظر آئے اسلام کو اس میں ڈھالنے کی کوشش کریں، ان کے اجتہاد کے عجیب و غریب نمونے آئے دن نظر آتے رہتے ہیں، اور اس تخریب کا نام انھوں نے اسلامی خدمت رکھا ہے، شیعوں کے نظام میں اگرچہ تنگی ہے، لیکن مذہبی ضبط و نظام کے نقطۂ نظر سے بہت مفید ہے۔

مقالات

اسلامک اسٹڈیز کا مقصد اور اسکی تاریخ

از ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، سابق پروفیسر عربی، پنجاب یونیورسٹی

معارف بابت فروری ۱۹۷۰ء میں آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے چھٹے اجلاس منعقدہ دار المصنفین اعظم گڈھ کی جو مفصل اور دلچسپ روداد ہمارے محترم سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کے قلم سے شائع ہوئی، اس کو میں نے بڑے ذوق و شوق سے پڑھا، بلکہ اس کا بڑے غور و خوض سے مطالعہ کیا، کیونکہ کانفرنس کے دوران میں بعض ایسے مسائل زیر بحث آئے جو علمی اور ملی دونوں اعتبار سے اہم ہیں، اور ہم سب لوگوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں، اس مضمون کے ذریعے میں بعض ایسے ہی مسائل کے بارے میں اظہار خیال کی اجازت چاہتا ہوں،

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے!

اگرچہ یہ مضمون کانفرنس کے انعقاد کے کئی ماہ بعد شائع ہو رہا ہے، لیکن مسائل زیر بحث اپنی نوعیت کے اعتبار سے عارضی اور وقتی نہیں ہیں، بلکہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں، اس لیے امید ہے کہ اس کو بعد از وقت تصور نہیں کیا جائے گا، اس تاخیر کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ معارف کا وہ شمارہ جس میں کانفرنس کی روداد شائع ہوئی تھی، مجھے بہت دیر سے موصول ہوا، اس کے علاوہ جب میں نے روداد پڑھی، اس وقت میں بعض ضروری کاموں کی تکمیل میں مصروف

تھا، اور مضمون کی تحریر کی طرف فوراً متوجہ نہ ہو سکا اور اسی مصروفیت میں ایک دو مہینے گذر گئے۔ آخر کار میں نے اپنے دل سے کہا کہ هٰذِهِ الصَّحِيفَةُ وَالْمَقَالَةُ وادن المجبرة المفعمة۔

جو علماء و فضلاء کانفرنس میں شریک ہوئے، اُن کو کیا معلوم تھا کہ کانفرنس کے پُر مغز خطبوں اور دلچسپ مفید مقالوں کے بعد ایک اجنبی دخیل کی سمع خراشی بھی بصورت تبصرہ برداشت کرنی پڑے گی۔

سید صاحب موصوف نے اس روداد کو ایسی تفصیل اور خوش اسلوبی سے لکھا ہے اور اپنے زور قلم اور حسن بیان سے کانفرنس کا ایسا دلنشین نقشہ کھینچا ہے کہ میں نے یوں محسوس کیا گویا میں بھی شریک محفل ہوں اور حاضرین کی دلچسپ باتیں اپنے کانوں سے سن رہا ہوں، اور مقرروں اور مقالہ نگاروں کے خیالات اور ارشادات سے مستفید ہو رہا ہوں۔ سید صاحب اپنی روداد میں لکھتے ہیں کہ "دار المصنفین کی دعوت پر ہندوستان کے اسلامیات کے تمام سیارے اس وقت یہاں آکر جمع ہو گئے ہیں، ان میں کوئی آفتاب ہے تو کوئی ماہتاب، کوئی عطارد ہے تو کوئی مشتری"۔ خیر گزری کہ بات عطارد اور مشتری تک رہ گئی، ورنہ سید صاحب اگر اختر شماری کرتے ہوئے شرکائے کانفرنس میں سے کسی کو "مریخ" اور کسی کو "زحل" کا خطاب عطا کر دیتے، تو ان کے پُر زور قلم کی روانی اور اس کے فیضان کو کون روک سکتا تھا!

بہر حال مجھے اس خیال سے کمال مسرت ہوئی کہ خدا کے فضل و کرم سے اس گئے گزرے زمانہ میں بھی چند ایک ایسے "مجنون مزاج" دیوانے موجود ہیں، جنھوں نے تمام اطراف ہند سے اور تمام دیار و امصار سے اپنا کام کاج چھوڑ کر شدِ رحال کیا، اور اپنے اپنے شانے لیکر دار المصنفین میں اس مقصد سے جمع ہوئے کہ "لیلی اسلام" کے زلف و کاکل کے سنوارنے میں حصہ لیں، اور اس کام کے لیے دار المصنفین سے زیادہ مناسب اور موزوں مقام اور کیا ہو سکتا تھا، جہاں عروس اسلام کی مشاطگی اور آراستگی کا کام نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے انتہائی خوش اسلوبی سے انجام پا رہا ہے۔

لیکن اس مسرت کے ساتھ ساتھ میرے دلِ حزیں میں ایک آہ بھری حسرت بھی ہے اور وہ حسرت یہ ہے کہ لیلی اسلام کے ان دیوانوں کی والہانہ شیفتگی اور وارفتگی کی روح پرور کیفیت کو میں اپنی مشتاق آنکھوں سے نہ دیکھ سکا، اور ان پر اپنی گہری دلی عقیدت کے پھول نچھاور نہ کر سکا۔

بآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند زِ ما سلام رسانید ہر کجا ہستند

اس سلسلے میں کانفرنس کے بانی یعنی فاضلِ معاصر ڈاکٹر عبد العلیم صاحب کا شکریہ کے ساتھ ذکر کرنا بھی لازم ہے، جب تک کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ یا دیگر مقامات میں منعقد ہوتے رہیں گے، ان کے اس "صدقۂ جاریہ" کا ثواب بھی خداوند کریم کے حضور سے ان کو ملتا رہے گا، کیونکہ خداوند کریم نے، جو عادل اور شکور ہے، خود فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔

مجھے وہ دن خوب یاد ہیں، جب میں اپنے طالب علمی (Wanderjahre) کے زمانے میں یورپ کے مختلف علمی مرکزوں کی سیر کرتا ہوا برلن پہنچا تھا، اور وہاں کی یونیورسٹی کے مشہور و معروف پروفیسر کارل ہائنرش بیکر (C. H. Becker) سے ملاقات کی تھی[1]، اس موقع پر پروفیسر ممدوح کی زبان سے میں نے پہلی مرتبہ عبد العلیم صاحب کا نام سنا تھا، پروفیسر موصوف آپکے علمی شوق اور آپ کی لیاقت و قابلیت کے قائل تھے، اور جب میں نے ان کی زبانی سنا کہ عبد العلیم صاحب ان کی نگرانی میں اعجاز القرآن کے موضوع پر مقالہ لکھ رہے ہیں تو میں اسی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کی مذہبی وابستگی اور ان کے اسلامی جذبہ کا معترف ہو چکا تھا۔ اب تو ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں اور ان کو خدمتِ اسلام اور حمایت اسلام کے وسیع مواقع حاصل ہیں، ان کے نیازمندوں کو کامل امید ہے کہ وہ ان مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔

میں جس امت کا ایک نہایت ادنیٰ اور ناکارہ فرد ہوں، اُس امتِ مرحومہ کی سرگذشت

[1] اس ضمن میں ملاحظہ کیجیے میرا مضمون "پروفیسر بیکر کے ساتھ چند دن" در رسالہ معارف بابت جولائی ۱۹۳۵ء۔

(یعنی تاریخ اسلام) کے ساتھ مجھے بدو شعور ہی سے گہرا شغف رہا ہے، اور یہ شغف ایک ایسے جنون کی حد تک طاری رہا ہے کہ عالم وحشت میں، خدا جانے میں نے کن کن وادیوں کی خاک چھانی ہے اور کن کن صحراؤں کی بادیہ پیمائی کی ہے۔ اس کے علاوہ اس امت کے جو اصول ومبادی (Principles) ہیں اور جو نصب العین (Ideals) ہیں، انکے قبول کرنے کے ساتھ ساتھ میں ان کی حقیقت اور اصلیت کو معلوم کرنا چاہتا تھا، اور ان کی صداقت کے جو دلائل وبراہین ہیں، ان کو جاننا چاہتا تھا، الغرض مجھے اسلام کے مذہبی اور تاریخی مسائل کے ساتھ جو گہری دلچسپی رہی ہے، اس کی وجہ سے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ میں نے اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کی روداد اور اس کے فکر انگیز خطبوں کو بڑے غور سے پڑھا، اور ان کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ میرے دل ودماغ میں خیالات نے ایک بے پناہ ہجوم کیا، اور میرے خیالات کا یہی وہ تلاطم ہے، جس سے مجھے اس تبصرہ کے لکھنے کی تحریک ہوئی ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ میں اپنے ناقص خیالات زیر بحث مسائل کے متعلق پیش کروں، میں اس امر کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ "اسلامک اسٹڈیز" کی جو اصطلاح ہمارے ہاں مغرب سے آئی ہے، اس کی اصلیت اور حقیقت کیا ہے اور اس کا موضوع بحث کیا ہے اور وہ کون سے مغربی علماء تھے، جنھوں نے اسلامک اسٹڈیز (Islamic Studies) کو عام مشرقیات (Oriental Studies) سے الگ ایک مستقل شعبۂ تحقیق وتدقیق کی صورت دی اور وہ کون سے مسائل تھے جن پر انھوں نے اس سلسلہ میں گفتگو کی، اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ اصطلاح ہمارے ہاں کب اور کیسے رائج ہوئی اور ہمارے لیے اسلامک اسٹڈیز کے کیا حدود ہیں اور اس کی غرض وغایت کیا ہے، یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ان تمام امور کے متعلق ہمارا ذہن بالکل صاف ہو تاکہ ہم اسلامیات کا دائرۂ تحقیق اور اس کا مقصد واضح طور پر متعین کرسکیں اور اس سے ہمیں

اس کا نصاب تعلیم وضع کرنے میں رہنمائی حاصل ہو، اور ہم ان تمام معاملات میں خطا اور غلطی سے محفوظ رہیں، کانفرنس کے اجلاس انشاء اللہ آیندہ بھی منعقد ہوتے رہیں گے لیکن اسکے ساتھ یہ بات اشد ضروری ہے کہ جو لوگ ان اجلاسوں میں شریک ہوں، ان کے ذہن میں اسلامیات کی اصلیت، اس کی غرض وغایت اور اس کے موضوعات کا ایک واضح تصور موجود ہو،

اسلامیات کا تعلیمی پہلو

اسلامک اسٹڈیز یعنی اسلامیات کے دو پہلو ہیں، ایک علمی اور تحقیقی (Research) اور دوسرا تعلیمی (Educational)۔ جہاں تک اس کے تعلیمی پہلو کا تعلق ہے، "اسلامیات" کی اصطلاح سے پہلے اسلام کی تعلیم کے لیے ہمارے اسلامی اسکولوں اور کالجوں میں "دینیات" کی اصطلاح رائج تھی، لیکن مروجہ اسلامیات کے مقابلہ میں دینیات کا تصور اور اس کا دائرہ بہت محدود تھا۔ میں نے ابتدائی تعلیم امرتسر کے اسلامیہ ہائی اسکول میں پائی تھی، جو سر سید احمد خاں مرحوم ومغفور کے زمانہ میں قائم ہوا تھا، اور علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے نام پر ایم، اے، او ہائی اسکول کہلاتا تھا، اس مدرسہ میں طبعی طور پر دینیات کی تعلیم کا بھی انتظام تھا، اور خدا کے فضل وکرم سے ہمارے اساتذہ بڑے متدین اور فرض شناس تھے، لیکن جہاں تک اسلام کی تعلیم کا تعلق ہے، مالا بدمنہ کی چند متفرق فصلوں کے سوا ہم طالب علم اور کچھ حاصل نہ کرسکے، انجمن حمایت اسلام لاہور کے تیار کردہ دینیات کے چند رسالے بھی ہم نے پڑھے، لیکن ان میں صرف طریقۂ ادائے نماز اور وضو اور غسل کے چند ضروری مسائل کا بیان تھا، قرآن مجید کے آخری پارہ کی دس بارہ سورتیں بھی تھیں، جو ہمیں بجا طور پر زبانی یاد کرائی جاتی تھیں، کیونکہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے علاوہ قرآن پاک کے کچھ حصہ کی قرأت بھی ضروری ہے، اب مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے، کہ دینیات کی چند سال کی تعلیم کے باوجود میں اس زمانہ میں اس وقت کے مروجہ طریق تعلیم کے ذریعہ سے "اجزائے ایمان"، "ارکان اسلام" اور "اخلاق اسلامی" کا کوئی

اجمالی تصور بھی حاصل نہ کرسکا۔ باقی رہے اسلام کے وہ ہمہ گیر فطری اور عقلی اصول اور وہ بلند نصب العین (Ideals) جو اس کے لیے وجہ امتیاز ہیں اور ہم حلقہ بگوشانِ اسلام کے لیے موجب افتخار اور وسیلۂ نجات ہیں، اور اسلام کے وہ تصورات (Concepts) جنکی بدولت اسلام نے ایک عالمگیر مذہب کا درجہ پایا، اور تمام عرب و عجم اور اسود و احمر کو اپنا غلام بنایا، افسوس صد افسوس کہ ان سے میرے کان ایک مدت تک آشنا نہ ہوسکے، اور اسکی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے اسکولوں میں دینیات کا نصاب ادھورا اور ناقص تھا۔

باقی رہے اسلامی کالج، ان میں بھی دینیات کی تعلیم تسلی بخش نہ تھی، کیونکہ کوئی نصاب معین نہ تھا۔ اساتذۂ کرام جس مرغوب اور دلپسند مضمون پر چاہا تقریر شروع کردیتے تھے، اور اس کے دوران میں جس حریف مولوی کو چاہا لتاڑ ڈالا اور جس "فرقہ ضالہ" پر چاہا برس پڑے، اُن کا کوئی محاسبہ کرنے والا نہ تھا۔

اسلامیات کے نصاب تعلیم کا مسئلہ بڑا اہم اور نازک ہے، اور اس کے کئی پہلو ہیں جو غور طلب ہیں، ان پر میں انشاء اللہ کسی آیندہ صحبت میں گفتگو کروں گا۔ کیونکہ سردست مجھے اسلامیات کے علمی اور تحقیقی پہلو کے متعلق چند ایک اصولی باتوں کی توضیح مطلوب ہے۔

اسلامک اسٹڈیز کی تاریخ

اب ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ بلاد مغرب میں اسلامک اسٹڈیز نے ایک مستقل شعبۂ علم کی حیثیت کیسے حاصل کی اور وہ کون سے علماء تھے، جنھوں نے یورپ میں علمی انداز میں اسلامی علوم کی تحقیق شروع کی اور جن کی مجموعی علمی مساعی سے اسلامک اسٹڈیز نے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کی۔

بلاد مغرب میں جب مشرقی ملکوں کا تحقیقی مطالعہ شروع ہوا تو ابتداء میں مستشرقین کی

توجہ بیشتر مشرقی زبانوں اور ان کے متعلقہ آداب پر مبذول رہی، اس کے بعد تاریخ و تمدن کی باری آئی، باقی رہے مذاہب و ادیان تو ان کی بحث اگرچہ ان کے دائرۂ تحقیق سے کلیۃً خارج نہ تھی، تاہم ایک مدت دراز تک ان پر خصوصی توجہ نہ دی جاسکی، آخر کار جب ان کی طبیعتیں لسانی (Philological) اور ادبی (Literary) مباحث سے قدرے سیر ہوچکیں، تو ان کی توجہ رفتہ رفتہ اسلامی دینی علوم کی طرف منعطف ہوئی اور اس توجہ کا بالآخر یہ نتیجہ ہوا کہ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں "اسلامک اسٹڈیز" نے ایک مستقل شعبہ کی حیثیت اختیار کی، یورپ میں اسلامک اسٹڈیز کی جس طرح تشکیل ہوئی، اس کی ایک واضح تاریخ ہے، جس کو یہاں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں، اور جس کا جاننا ان تمام احباب کے لیے ضروری ہے جو مشرق میں اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں اور اس کو اختیار کرکے اسلامک اسٹڈیز کی حدود میں رہ کر تحقیقی یا تعلیمی کام کرنا چاہتے ہیں۔

اسلامک اسٹڈیز کا پہلا رکن

اسلامیات کے تاریخی جائزہ کے سلسلہ میں مجھے سب سے پہلے مشہور جرمن مستشرق پروفیسر نولڈکہ (Noldeke) (۱۸۳۶ء تا ۱۹۳۰ء) کا نام نامی لینا ہے جنھوں نے ۱۸۶۰ء میں اپنی مشہور "تاریخ القرآن" شائع کی،[1] اور یورپ میں قرآن پاک کے متعلق تحقیق و تدقیق کا علمی انداز میں آغاز کیا، اور اس طرح سے گویا اسلامک اسٹڈیز کا پہلا سنگ بنیاد رکھا، ۱۸۶۰ء کا سنہ اس لحاظ سے بھی یادگار ہے کہ اس کے صرف ایک سال بعد یعنی ۱۸۶۱ء میں ولیم میور نے "لائف آف محمد" کے نام سے سیرت نبوی پر ایک جامع کتاب لندن سے چار جلدوں میں شائع کی، لیکن اس وقت مجھے نولڈکہ کی "تاریخ القرآن" کا تذکرہ مقصود ہے جس سے یورپ میں قرآنی مباحث کی ابتدا علمی انداز میں ہوئی۔ اس تالیف میں انھوں نے

---

[1] Theodor Noldeke, Geschichte des Qorans, Gottengen, 1860

قرآن شریف کی جمع وتدوین، اس کے اسٹائل اور مکی ومدنی سورتوں کی تقسیم اور ان کے مضامین کی تفصیل کے علاوہ سورتوں کی ترتیب نزولی سے بھی بحث کی تھی،[1] ترتیب نزولی کی یہ بحث یورپ کے لیے بالکل جدید نہ تھی، کیونکہ نولڈکے سے پہلے ۱۸۴۴ء میں گستاو وائل (G. Weil) اس مسئلہ پر بحث کر چکے تھے، بہر حال پروفیسر نولڈکے کی تصنیف میں مباحث کے لحاظ سے بڑی جامعیت تھی، اور ان مباحث پر عیسائی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ محض علمی انداز پر گفتگو کی گئی تھی۔

پروفیسر ممدوح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "تمام انبیاءؑ میں سے رسول عربی سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں" یہ رائے اگرچہ ناقابل انکار تاریخی حقائق پر مبنی ہے، تاہم اس قسم کا واشگاف اعتراف پروفیسر نولڈکے کی علمی دیانت اور انکی ذاتی عظمت کی دلیل ہے، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے اس بات کو آگے نہیں بڑھایا، مثلاً وہ اس اظہار رائے کے بعد یہ سوال اٹھا سکتے تھے کہ آخر کار رسول کریمؐ کی بے مثال کامیابی کے کیا اسباب تھے، اگر وہ ان اسباب کی تحقیق کرتے تو اس بحث کے اثنا میں نہ صرف آنحضرتؐ کی جادو بھری شخصیت کے بہت سے پہلو ہماری نظر کے سامنے آجاتے، بلکہ اسلام کی قوت اور کشش اور اس کی امتیازی خصوصیات کے بارے میں بھی بہت سے دلچسپ حقائق کا انکشاف ہوتا۔

تاریخ القرآن

"تاریخ القرآن" کی تالیف کے بعد پروفیسر نولڈکے کا اشہب قلم السنۂ سامیہ (Semitic Studies) کے وسیع میدان میں نصف صدی تک اپنی حیرت انگیز جولانی دکھاتا رہا، اور ان کو تاریخ القرآن پر نظر ثانی کرنے یا اس کی توسیع کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔ یہ کام تاہم ان کے لائق شاگرد پروفیسر شوالی (Shwally) نے انجام دیا اور

[1] قرآن پاک کی سورتوں کی ترتیب نزولی پر پروفیسر محمد اجمل خاں مرحوم "ترتیب نزول قرآن مجید" کے نام سے ایک مستقل کتاب ۱۹۵۰ء میں دہلی سے شائع کر چکے ہیں۔

اس کتاب کے مضامین میں اتنا اضافہ کیا کہ اس کی ایک جلد سے ۲ دو جلدیں بن گئیں، جو یکے بعد دیگرے ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئیں، پروفیسر شوالی اپنے نامور استاد کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے، لیکن "تاریخ القرآن" کی توسیع کا کام بدستور جاری رہا، چنانچہ سنہ ۱۹۳۸ء میں تیسری جلد کا اضافہ ہوا جس کے لیے ہم پروفیسر برگشسٹراسر اور پرٹیسل کے ممنون ہیں، اس تیسری جلد میں قرآن مجید کے متن اور اس کی مختلف قرأت سے بحث ہے۔

پروفیسر نولڈکہ کے علمی کارناموں کے تذکرہ کے لیے اس تبصرہ کا دامن تنگ ہے، لہٰذا اس موقع پر صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے امام المستشرقین تھے، مشرقیات کی ریاست وقیادت ایک مدت سے فرانسیسی مستشرقین کے ہاتھوں میں چلی آرہی تھی، لیکن انیسویں صدی کے نصف ثانی میں یہ لیڈرشپ قطعی طور پر جرمنی کی طرف منتقل ہوگئی، اور جن جرمن مستشرقین کی نمایاں علمی مساعی کی بدولت یہ قیادت جرمنی کے حصہ میں آئی، پروفیسر نولڈکہ اس گروہ کے سرخیل تھے اور ہمارے نقطۂ نظر سے یہ بات قابل توجہ اور معنی خیز ہے، کہ یورپ میں اسلامک اسٹڈیز کی عمارت کا پہلا ستون ایک ایسے نامور اور ممتاز عالم کے ہاتھوں قائم ہوا جس کو علمی دنیا میں ایک نہایت اعلیٰ وارفع مقام حاصل تھا،

قرآنی مباحث کے ضمن میں پروفیسر ہورووٹس کی "تحقیقات قرآنیہ"[1] بھی قابل ذکر ہے، جس میں فاضل مصنف نے قصص القرآن کے علاوہ ان تمام اعلام سے بھی بحث کی ہے، جو قرآن پاک میں مذکور ہوئے ہیں، آجکل جرمنی میں پروفیسر روڈی پاریٹ (Rudi Parit) قرآن مجید کے متعلق تحقیقی کام کر رہے ہیں، اور انھوں نے اسی سلسلہ میں قرآن شریف کا جرمن زبان میں ایک تازہ ترجمہ شائع کیا ہے، گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن

[1] Josef Horovitz, Koranische Untersuchungen. Berlin, 1926

اور ولندیزی (ڈچ) زبانوں میں قرآن شریف کے متعدد نئے ترجمے شائع ہو چکے ہیں، جنکی اپنی اپنی خصوصیات ہیں، مثلاً پروفیسر کرامر کے ڈچ ترجمہ کے ساتھ مضامین کا ایک مفصل انڈکس بھی شامل ہے، قرآنی مباحث کے ضمن میں قرآن پاک کے تراجم کا ذکر لازمی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اطناب کے خوف سے اس موقع پر ان کی تفصیل نہیں دی جا سکتی۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جس طرح قرآن مجید دین اسلام کی اساس اور بنیاد ہے، اسی طرح قرآن پاک کے متعلقہ مباحث کو اسلامیات میں اولین درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر نولڈکہ نے یورپ میں ان مباحث کا علمی طریق پر آغاز کر کے اسلامک اسٹڈیز کی عمارت کا پہلا ستون قائم کیا، اور وہ خود ان اسٹڈیز کے اولین ارکان میں سے ہیں۔

علم تفسیر القرآن | قرآنی مباحث کے ساتھ علم تفسیر کا ذکر کرنا بھی مناسب اور ضروری ہے۔ اگرچہ یورپ میں امام جلال الدین سیوطی کی طبقات المفسرین چھپ چکی تھی، لیکن علم تفسیر اور خصوصاً تاریخ التفسیر کے علمی مطالعہ کی منزل ہنوز بہت دور تھی۔ اسی عدم توجہ کا یہ نتیجہ ہے کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بیرن کارادادو (Baron carra de Vaux) کے قلم سے "تفسیر" پر جو آرٹیکل شائع ہوا تھا، وہ اس علم کی عظمت اور اہمیت کے مقابلہ میں بالکل مختصر، ناکافی اور تشنہ تھا، اس کمی کو آخر کار پروفیسر گولڈ سیہر نے پورا کیا، انھوں نے ۱۹۱۸ء میں علم تفسیر کے ارتقا اور مفسرین کے طبقات اور ان کے رجحانات پر جو لکچرز دیے تھے، وہ ۱۹۲۰ء میں لائڈن سے جرمن زبان میں طبع ہو کر شائع ہو گئے تھے[۱]، امام سیوطی نے مفسرین کے طبقات کی ترتیب زمانی لحاظ سے کی تھی، لیکن گولڈ سیہر نے ان کے طبقات ان کے مخصوص رجحانات کے اعتبار سے قائم کیے، مثلاً ان کے نزدیک ایک گروہ ایسے علماء کا ہے جنھوں نے قرآن کی تفسیر اسلامی روایات اور حدیث کی روشنی میں کی ہے، مثلاً

۱؎ Ignaz Goldziher, Die Rechtungen der islamischen Koran-auslegung. Leiden 1920

امام ابن جریر طبری وغیرہ۔ ایک طبقہ معتزلی خیال کے مفسرین کا ہے، جنھوں نے قرآن مجید کی تفسیر اپنے مخصوص عقائد کے مطابق کی ہے، اور جن کے سرخیل علامہ زمخشری ہیں، اسی طرح ایک گروہ متصوفہ کا ہے، اور سب سے آخر میں زمانہ حال کے مفسرین ہیں، جو عہد حاضر کے طرز خیال اور نظریات سے متاثر ہوئے ہیں، انھوں نے قرآن کو اسی انداز میں سمجھا ہے اور اسی انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے، ایک مصری فاضل عبد القادر صاحب نے اس کتاب کو مذاہب التفسیر الاسلامیہ کے نام سے عربی میں ترجمہ کر دیا ہے، جس کا مطالعہ ہمارے علماء کے لیے از بس مفید ہے، پروفیسر گولڈ سیہر کے بعض بیانات محل نظر ہیں، لیکن فاضل مترجم نے ان کی نشاندہی کر دی ہے، اور علمائے کرام خود بھی ان پر آسانی سے متنبہ ہو سکتے ہیں۔

بیضاوی کا درس جرمنی میں | علم تفسیر کے سلسلہ میں تفسیر بیضاوی کے اسی درس کا ذکر کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جو لائپزگ یونیورسٹی میں وہاں کے عربی کے مشہور عالم پروفیسر فلائشر گذشتہ صدی میں عربی کی تعلیم کے ضمن میں دیا کرتے تھے، پروفیسر ممدوح نے اپنے درس کے لیے بیضاوی کو بھی کمال احتیاط اور صحت کے ساتھ ایڈٹ کر دیا تھا، جو ان کے تبحر علمی پر شاہد عدل ہے، اس عمدہ اڈیشن کی اشاعت میں ان کو جو حیرت انگیز اور لائق ستائش کامیابی ہوئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عربی صرف و نحو کی پیچیدگیوں سے خوب واقف تھے، اور عربی لغت پر بھی بڑا عبور رکھتے تھے، اور جس محنت سے وہ اپنے درس کی تیاری کرتے تھے، اس کی کیفیت ان کے ایک لائق شاگرد پروفیسر اگسٹ ملر نے ان کے حالات میں لکھی ہے، وہ رقمطراز ہیں کہ ایک دن ہم لوگ حسب معمول سبق کے لیے ان کے حجرہ درس (لیکچر روم) میں پہنچے تو ہم کیا دیکھتے ہیں کہ پروفیسر فلائشر وہاں پہلے ہی سے موجود ہیں، اور ایک اونچے سے منبر پر تفسیر بیضاوی دھری ہے، اور اس کے پاس ہی شیخ زادہ کا حاشیہ کھلا ہے، اور وہ اس کے مطالعہ میں ایسے محو ہیں کہ کئی منٹوں تک ان کو اپنے شاگردوں کی

آمد اور ان کی موجودگی کا مطلق کوئی احساس نہیں ہوا۔"

ایک دن پروفیسر فلائشر نے اپنے شاگردوں سے یہ قصہ بیان کیا کہ میں نے سنا ہے کہ میرا بیضاوی کا اڈیشن کسی طرح قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام کے پاس بھی جا پہنچا۔ پہلے تو انھوں نے اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور اسے درخور اعتنا نہ سمجھا، لیکن کچھ دیر کے بعد، خدا جانے، ان کے دل میں کیا خیال آیا کہ کتاب کو دوبارہ اٹھایا اور اسے کھول کر پڑھنا شروع کیا، اور دیر تک پڑھتے رہے اور پھر حاضرین مجلس سے مخاطب ہو کر کہا کہ "مجھے اس مغربی عالم پر تعجب ہے، جو تفسیر بیضاوی کو اسی خوبی کے ساتھ سمجھتا ہے جس خوبی سے کوئی مشرقی عالم سمجھ سکتا ہے"۔

پروفیسر گولڈ سیہر

پروفیسر اگناز گولڈ سیہر بوڈاپسٹ (ہنگری) کے رہنے والے تھے[ے]، قومیت اور زبان کے لحاظ سے ہنگیرین اور مذہباً یہودی تھے۔ اپنے علم و فضل کی بدولت اگرچہ انھوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی لیکن یہودی ہونے کی وجہ سے ان کے اپنے وطن میں خاطر خواہ قدردانی نہ ہو سکی لیکن اس کے باوجود ان کی ہمت و عزیمت میں فرق نہ آیا، اور وہ تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف میں بدستور مصروف رہے۔ یورپ میں اسلامک اسٹڈیز کو فروغ دینے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے، ہنگیرین کے علاوہ جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں لکھتے تھے، انکے بے شمار مقالوں، رسالوں اور کتابوں کی تفصیل ان کی ایک ببلیوگرافی یعنی فہرست مؤلفات میں مندرج ہے جو ایک سو صفحات پر مشتمل ہے، اور ۱۹۲۷ء میں پیرس میں طبع ہو چکی ہے۔ ان کو عربی زبان اور ادب سے بھی شغف رہا ہے، عربی ادب کی تاریخ پر ان کی ایک مختصر سی کتاب ہے، جس کو ان کے شاگرد ڈاکٹر سموز حی نے انگریزی میں منتقل کر دیا ہے اور آجکل متداول ہے، ان کو عربی زبان پر بہت اچھا عبور تھا۔

ے Ignaz Goldziher (b. 1850 – d. 1921)

پروفیسر اگناز گولڈ سیہر کے نام کا پہلا جزو Ignaz دراصل اگنی ہو جو بگڑ کر ہنگیرین زبان میں اگناز بن گیا ہے۔

چنانچہ ان کی عادت تھی کہ جب کبھی ان کے پاس کوئی مطبوعہ عربی کتاب پہنچتی تھی تو وہ اس کی تصحیفات اور اغلاط کو ان کے سیاق و سباق سے بھانپ لیتے تھے، اور پھر اپنی تصحیحات کو قلمبند کر کے اس کتاب کے اڈیٹر کو بھیج دیتے تھے، دوسروں کی حوصلہ افزائی اور معاونت کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیتے تھے، ڈاکٹر آرنلڈ اپنی "پریچنگ آف اسلام" کے طبع ثانی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "پروفیسر گولڈ سیہر نے میری کتاب کے موضوع میں جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے، اس سے اپنے کام کو جاری رکھنے میں میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے"۔

پروفیسر گولڈ سیہر بڑے متین اور متدین قسم کے عالم تھے، ان کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کے موقع پر ایک سوشل اجتماع میں انھوں نے دیکھا کہ چند نوجوان مسلمان ایک میز کے گرد کھڑے شغل شراب کر رہے ہیں، وہ ان کی طرف بڑھے اور ان سے کہا کہ "میں جانتا ہوں اور تم بھی خوب جانتے ہو کہ اسلام میں شراب نوشی حرام ہے، بڑے افسوس اور رنج کی بات ہے کہ تم لوگ اس طرح علانیہ اپنے شعائر دینی کی بے حرمتی کر رہے ہو۔" فاعتبروا یا اولی الابصار۔

علم حدیث کا مطالعہ

دیگر علمی خدمات کے علاوہ گولڈ سیہر کا ایک مخصوص کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے یورپ کے علمی حلقوں میں علم حدیث کے ساتھ ایک مستقل فن کی حیثیت سے اعتنا کیا اور اس علم کے تمام مسائل سے بحث کی۔ اگرچہ گولڈ سیہر سے پہلے ولیم میور اپنی "لائف آف محمدؐ" کے طویل مقدمہ میں اسلامی روایات کا جائزہ لے چکا تھا، لیکن اس کی تنقید محض اس اعتبار سے تھی کہ سیرت نبویؐ کے سلسلہ میں یہ روایات کس حد تک قابلِ استناد ہیں، لیکن گولڈ سیہر نے حدیث نبوی کے ساتھ ایک مستقل فن کی حیثیت سے بحث کی، چنانچہ جب انھوں نے اپنی مشہور کتاب مطالعات محمدیہ "(یعنی اسلامیہ) دو جلدوں میں شائع کی تو اس کی دوسری جلد کو بیشتر علم حدیث کے متعلق

مباحث کے لیے وقف کر دیا۔ اور اس کے بعد یورپ میں حدیث نبوی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بیشتر اسی کتاب سے ماخوذ ہے، مثلاً پروفیسر گیوم (Guillaume) نے Traditions of Islam کے نام سے جو کتاب ۱۹۲۴ء میں شائع کی تھی وہ بھی گویا گولڈ سیہر کی تصنیف کا انگریزی خلاصہ ہے۔

گولڈ سیہر نے دیگر باتوں کے علاوہ ضعیف اور موضوع حدیثوں کا بھی ذکر کیا ہے، اور وضع حدیث کے اسباب و محرکات سے بھی بحث کی ہے، نقد حدیث ہم مسلمانوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں، ہمارے علمائے سلف نے موضوع اور کمزور حدیثوں کا جو پایۂ استناد سے ساقط تھیں، خود ہی چھانٹ کر الگ کر دیا ہے، اور کھوٹے کھرے کی پہچان کے اصول قائم کر دیے ہیں، لیکن "تنقید حدیث" کا کام اگر اغیار کے ہاتھوں انجام پائے، تو یہ "تنقید حدیث" بسا اوقات "تنقیص حدیث" کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور موضوع اور کمزور حدیثوں کا بار بار ذکر کرنے کا ایک فوری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پڑھنے والا یا سننے والا حدیث کے سارے ذخیرے ہی سے بدظن ہو جاتا ہے، اور وہ بالآخر صحیح حدیثوں سے بھی غافل ہو جاتا ہے، اور ان کی قدر و منزلت اس کے دل سے اتر جاتی ہے اور مطالعۂ حدیث اور عمل بالحدیث کے جو فوائد اور برکات ہیں، ان سے وہ محروم ہو جاتا ہے۔

انکار حدیث کا فتنہ

ہندوستان وہ ملک ہے جس میں کسی زمانے میں شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اور دیگر علمائے امت نے علم حدیث کے جھنڈے بلند کیے تھے، اور آج یہ حالت ہے کہ ان ہی دیار میں "انکار صحت حدیث" بلکہ "انکار حجیت حدیث" کی ایک ایسی باد سموم چلی ہے جس سے حدیث کا استخفاف کرنا اور اس کی تنقیص کرنا گویا ایک فیشن بن گیا ہے، بلکہ "روشن خیالی" کی دلیل سمجھی جاتی ہے، لیکن اس تنقیص حدیث کے نتائج اور مضمرات نہ صرف علمی بلکہ ملی لحاظ سے اتنے دور رس اور اتنے خطرناک ہیں کہ میں ان کی طرف اشارہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ "انکار صحت حدیث" دراصل اسلام کے

خلاف اغیار کا ایک حربہ تھا جس سے وہ ہم پر وار کرنا چاہتے تھے، اغیار اس بات کو خوب بھانپ گئے تھے کہ اسلام کی قوت اور کشش کا راز دیگر امور کے علاوہ اس بات میں مضمر ہے کہ سچے مسلمانوں کو اپنے آقائے نامدارؐ کے ساتھ دلی شغف ہے اور ایسی والہانہ عقیدت ہے کہ اس نام کی عزت کے لیے اور اس کے ناموس کی حفاظت کے لیے کٹ مرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، اور جب تک مسلمانوں کی یہ عقیدت اپنے پیغمبر کے ساتھ قائم ہے، ان کو اسلام سے منحرف کرنا ناممکن ہے، اس رشتۂ عقیدت کو توڑنے کا ایک طریقہ انھوں نے یہ سوچا بلکہ اختیار کیا کہ حدیث نبویؐ کی تنقید ایسے پیرایہ میں کی جائے جس سے حدیث نبویؐ کی وقعت مسلمانوں کے دلوں سے جاتی رہے، کیونکہ ان کو اس بات کی پوری امید تھی کہ جب مسلمان حدیث نبوی سے بدظن ہو جائیں گے تو ان کے ہادیؐ کی جو آواز ان کے کانوں میں حدیث کے ذریعہ سے پہنچ رہی ہے، خود بخود منقطع ہو جائے گی، اور اس کے ساتھ ہی ان کی عقیدت میں بھی یقیناً فرق آ جائے گا، اور اسلام کے ساتھ ان کی وابستگی کے جو رشتے ہیں، ان میں سے ایک قوی رشتہ ٹوٹ جائے گا، اور اس صورت میں مسلمانوں کو اپنے دین سے منحرف کرنا آسان ہو جائے گا۔

حدیث نبوی کا احترام

ہمارے اسلاف کے دلوں میں حدیث نبوی کا جو احترام تھا اور وہ جس طرح ہر حالت میں اس کا ادب ملحوظ خاطر رکھتے تھے، وہ ایک چھوٹے سے واقعہ سے بخوبی ثابت ہے۔ امام سیوطی نے جب کمزور اور مشکوک حدیثوں کو چھانٹ کر ایک کتاب میں الگ جمع کر دیا، تو آپ کو خوب معلوم ہے کہ انھوں نے اس کا نام کیا رکھا تھا، انھوں نے اس کا نام رکھا تھا "اللآلی المصنوعۃ" یعنی بناوٹی موتی۔ اس نام کی لطافت دیکھیے کس قدر نفیس اور خوبصورت نام ہے، جس کے ایک ایک حرف سے حدیث نبوی کا ادب اور احترام مترشح ہے۔ اس نام پر غور کرنے سے صاف عیاں ہے کہ امام صاحب کے نزدیک اگرچہ یہ روایتیں موضوع ہیں، لیکن آخر کار صحیح اور سچی حدیثوں کے نمونہ پر

بنائی گئی ہیں، اس لیے ان کی مثال ان مصنوعی موتیوں کی ہے جو مصنوعی ہونے کے بعد آخرکار موتی ہیں!

اسلامک اسٹڈیز کا دوسرا رکن

اس جملہ معترضہ کے بعد اب میں اپنے موضوع کی طرف لوٹتا ہوں، اور عرض کرتا ہوں کہ پروفیسر گولٹ سیہر پہلے مغربی عالم تھے جنھوں نے علم حدیث پر سیر حاصل بحث کی اور یہ وہ دوسرا ستون تھا، جس پر یورپ میں اسلامک اسٹڈیز کی عمارت تیار ہوئی، اور خود پروفیسر گولٹ سیہر نولڈکہ کے ساتھ اسلامیات کے دوسرے رکن قرار پائے۔

کتب حدیث کے انڈکس

علم حدیث کے سلسلہ میں مجھ پر اس بیش قیمت اور قابل قدر خدمت کا تذکرہ کرنا لازم ہے، جو ہالینڈ کی لائڈن یونیورسٹی میں ایک مدت سے کتب حدیث کے مطالعہ کی تسہیل کے لیے جاری ہے، جب گولٹ سیہر کی تحریروں سے علم حدیث کی اہمیت واضح ہوگئی تو لائڈن یونیورسٹی کے پروفیسر ونسنک نے کتب حدیث سے استفادہ کرنے والوں کی سہولت کے لیے دو منصوبے بنائے۔ ایک منصوبہ کے مطابق اس نے حدیث کے مضامین اور مطالب کا ایک انڈکس یعنی اشاریہ خود تیار کیا اور اس کا نام ہینڈ بک آف ارلی محمڈن ٹریڈیشن رکھا[1]، اور سینکڑوں عنوانات مثلاً صوم، صلوٰۃ، تراویح، اذان وغیرہ قائم کیے اور ان کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دے کر انکے ذیل میں ان تمام احادیث کی نشاندہی کر دی ہے، جن میں ان مضامین کا ذکر آیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے اعلام کو بھی اپنے اشاریہ میں شامل کیا ہے۔ اور اس طریق سے اکثر اکابر صحابہ وصحابیات کا بھی ذکر خیر آگیا ہے، مثلاً اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ حضرت ابو بکرؓ یا حضرت علیؓ یا حضرت بلالؓ کا یا کسی اور صحابی یا صحابیہ

[1] Arent Jan Wensink (b. 1882; d. 1939): A Hand Book of Early Muhammadan Tradition, Alphabetically Arranged. 269 pages. Lieden, 1927

کا ذکر احادیث وآثار کی کتابوں میں کہاں کہاں اور کس سلسلہ میں آیا ہے، تو اُن کے ناموں کے تحت آپ کو اُن تمام احادیث وروایات کا سراغ مل جائیگا جن میں ان حضرات کا ذکر آیا ہے۔ اس غرض سے پروفیسر ونسنک نے صحاح ستہ کے علاوہ موطا امام مالکؒ، مسند احمد بن حنبلؒ، سنن دارمی، مسند طیالسی، سیرت ابن ہشام، مغازی واقدی اور طبقات ابن سعد کو بھی پیش نظر رکھا ہے، اور ان کے باقاعدہ حوالے دیے ہیں، پروفیسر ممدوح نے حدیث نبوی اور اسلامی اخبار وروایات کے اس سارے وسیع اور ضخیم ذخیرے پر جس محنت شاقہ اور استیعاب کے ساتھ غائر نگاہ ڈالی ہے، اس کے تصور سے انسان حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی اس بات پر بھی کمال تعجب ہوتا ہے کہ کارکنانِ قضا وقدر نے کس طرح ایک مغربی عالم سے حدیث نبوی کی ایسی بیش بہا خدمت لی ہے۔ مصنف کی محنت اور دیدہ ریزی اور اس کے اشاریہ کی افادیت کا اندازہ وہی لوگ کماحقہ لگا سکتے ہیں جن کو اس کی طرف رجوع کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔

مفتاح کنوز السنہ

یہ انڈکس اسقدر مفید ہے کہ مصر کے ایک فاضل محمد فواد عبدالباقی نے اسے مصنف کی اجازت سے عربی میں کر دیا تھا، اور اسے مفتاح کنوز السنہ کے نام سے ۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) میں قاہرہ سے شائع کر دیا تھا، اسکی ابتدا میں مرحوم منشی المنار سید محمد رشید رضا کا دیباچہ اور مرحوم قاضی احمد محمد شاکر کا لکھا ہوا مقدمہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ ان وسیع القلب اور عالی ظرف مصری علماء نے کتاب مذکور کی افادیت کا پورا پورا اعتراف کیا ہے، اور اس کے مصنف کی جانفشانی کی دل کھول کر داد دی ہے، چنانچہ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ "کتب حدیث اس شخص کے لیے جس نے ان کا مدت دراز تک مطالعہ نہ کیا ہو، بند صندوقوں کی مانند ہیں، اور اس کے لیے اُن تک رسائی پانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے لیکن اب محمد فواد عبدالباقی صاحب نے اس شخص کے لیے ایک ایسی کلید تیار کر دی ہے جس کے ذریعہ سے وہ ان خزانوں تک پہنچ سکتا ہے، اور جلائے عقل اور صفائے قلب حاصل کر سکتا ہے۔" اسی طرح سید محمد رشید رضا رقمطراز ہیں کہ کاش کہ

مجھے یہ کتاب اوائل عمر میں دستیاب ہوتی، جب میں کتب حدیث کے ساتھ اشتغال رکھتا تھا، تو اس صورت میں میری عمر کا تین چوتھائی حصہ بچ جاتا، جو میں نے حدیثوں کی تلاش اور کتب حدیث کی ورق گردانی میں صرف کیا ہے۔"

المعجم لالفاظ الحدیث

پروفیسر ونسنک کا دوسرا منصوبہ الفاظ حدیث کا انڈکس ہے، جسکی تدوین و اشاعت ایک وسیع پیمانہ پر کئی برس سے جاری ہے، اس اشاریہ کا عنوان المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی ہے[1]، جس میں ایک ایک لفظ کو لیکر اس کے ذیل میں اُن تمام حدیثوں اور روایتوں کے پورے جملے نقل کر دیئے گئے ہیں، جن میں وہ لفظ استعمال ہوا ہے، اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ منصوبہ بہت لمبا ہے، اس کے بانی پروفیسر ونسنک سنہ ۱۹۳۹ء میں اپنے خالق کے سایۂ رحمت میں جا چکے ہیں، ان کے بعد مینسنگ (Mensing) صاحب نے تالیف و تدوین کا کام سنبھالا تھا لیکن وہ بھی چند سالوں کے بعد انتقال کر گئے، اس معجم کے اڈیٹر یکے بعد دیگرے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو رہے ہیں، لیکن معجم کی تدوین اور اشاعت کا کام بدستور جاری ہے، کیونکہ اسکے پبلشر کو اس خاص کام کے لیے یورپ کی متعدد اکاڈمیوں، علمی مجلسوں اور حکومتوں کی طرف سے مالی امداد ملتی ہے، اس کی تالیف و تدوین میں اس وقت تین چار فضلاء شریک ہیں اور اسکی تین ضخیم مجلدات بڑی تقطیع پر شائع ہو چکی ہیں اور باقی حصہ کی اشاعت بالاقساط جاری ہے، کام بہت حد تک انجام پا چکا ہے لیکن ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔

اے ابنائے ملت! یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جو کام ہمارے کرنے کا تھا، اس کو اغیار انجام دے رہے ہیں، مغرب کے چند علماء اس پر اپنی عزیز عمریں صرف کر چکے ہیں، اور دیگر چند فضلاء ابھی تک اس پہ دیدہ ریزی کر رہے ہیں، اور ان کی علمی مجلسیں اور ان کی حکومتیں ان کی کفالت کرتے ہوئے اس علمی منصوبہ کی تکمیل کے لیے اب تک لاکھوں روپیہ کے عطیے دے چکی ہیں۔

(باقی)

---

[1] Concordance et Indices de la Tradition musulmane. Brill. Leiden

پاکستان میں دو مہینے

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۳)

ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے موجودہ ڈائرکٹر موج کوثر اور رود کوثر کے مشہور مصنف اور غالبیات کے ماہر جناب شیخ محمد اکرام صاحب آئی، سی، ایس ہیں، جو سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر اپنی علمی خدمت سے اس کو سیراب کر رہے ہیں، وہ موج کوثر میں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی نسبت بقول ان ہی کے خوب زہر اگل چکے ہیں (شبلی نامہ ص ۱۱) اور شبلی نامہ میں مولانا شبلی کے متعلق کچھ ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو وابستگانِ شبلی کو پسند نہیں ہیں، اور دار المصنفین کو بڑھتے ہوئے امراض میں مبتلا بتایا ہے (ص ۱۱)، اس لیے خیال ہوا کہ وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک حقیر شاگرد اور مولانا شبلی کے آستانہ کے ایک خادم اور دار المصنفین کے ایک ادنیٰ خدمت گزار سے بہت انشراح کے ساتھ ملنا پسند نہیں کریں گے لیکن جب میں ان کے ادارہ میں پہنچا تو بڑی خندہ پیشانی سے ملے، ان کے چہرہ پر کبرسنی کے زیادہ آثار نہ تھے، بلکہ اس پر تازگی بھی، شگفتگی تھی، وقار بھی اور علم و ادب کی خدمت کرنے کا عزم بھی، انھوں نے ادارہ کے تمام رفقاء کو اپنے کمرہ میں بلا لیا، پھر دیر تک خوشگوار گفتگو ہوتی رہی، پوچھا کہ دار المصنفین کا کیا حال ہے، میں نے عرض کیا کہ وہ تو علمی بھکشوؤں کی ایک جماعت ہے، جو بھکشوؤں کا حال ہونا چاہیے، وہی وہاں کے بھکشوؤں کا ہے، یہ سن کر ہنسنے لگے، مولانا شبلی پر بھی گفتگو آگئی جو بڑھی بھی تھی کہ میں نے عرض کیا کہ پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک لطیفہ سن لیں جس کا ایک ٹکڑا تو ہم لوگوں کیلئے ہے

اور دوسرا آپ کے لیے ہے، خلافت تحریک کے زمانہ میں حضرت سید صاحب کی قیادت میں خلافت کا ایک وفد حجاز گیا، جس میں مولانا محمد علی مرحوم بھی تھے، وہاں دونوں میں اختلاف ہوگیا، اور جب یہ وفد ہندستان واپس آیا تو مولانا محمد علی مرحوم نے اپنے اخبار ہمدرد میں مضامین لکھنے شروع کیے جن میں سید صاحب کی مخالفت تھی، سید صاحب نے ان مضامین کا کوئی جواب نہیں دیا، وہ ان ہی دنوں دہلی تشریف لے گئے، تو مولانا محمد علی سے بھی ملے، ان سے فرمایا کہ آپ میرے خلاف جتنا بھی لکھیں گے میں خاموش رہوں گا، مولانا محمد علی کی حاضر جوابی تو مشہور ہے، انھوں نے برجستہ فرمایا، میں لکھ کاہے کو رہا ہوں، آپ کو خاموش کرنے کے لیے ہی تو لکھ رہا ہوں"۔ اس لطیفہ سے پورا کمرہ قہقہوں سے گونجنے لگا، اس کے بعد مجلس کا رنگ ہی بدل گیا، مولانا شبلی پر پھر گفتگو آگئی تو میں نے کہا کہ ان پر جا بے جا جتنی بھی تنقیدیں کیجائیں لیکن جن کے لیے انھوں نے اتنی کتابیں لکھی ہیں، وہ ان کو پڑھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنی گل و گلزار سے بسی ہوئی تحریروں کے ذریعہ انکی گذشتہ عظمت و شان کا تاج ان کو پہنا رہے ہیں، اسی اور صرف اسی میں ان کی عظمت کا راز ہے، جناب اکرام صاحب نے اس سے اتفاق کیا، پھر شعر العجم کا ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ اس پر ہر قسم کی تنقیدوں کے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑیگا کہ شعر العجم نے ہندوستان میں ایک خاص قسم کا ادبی اور تنقیدی ذوق پیدا کیا، اور فارسی شاعری سے لطف و لذت لینے کا سلیقہ سکھایا، اکرام صاحب نے اس کی بھی تائید کی، کچھ اور گفتگو بڑھی تو میں نے عرض کیا کہ پنجاب کے ایک دیدہ ور اہل قلم نے مولانا شبلی کی انشا پردازی کا بڑا اچھا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں بلٹزکرگ (Blitzkrieg) استعمال کرتے ہیں، وہ ایک ہلہ بول کر، ایک طوفانی حملہ کر کے پہلے ذہن کو مفلوج اور مغلوب کر دیتے ہیں، پھر اپنی بات منوا لیتے ہیں، وہ تسخیر ذہن کا جو کام اپنی چند سطروں میں کرتے ہیں، دوسرے لوگ اپنی طویل تحریروں میں نہیں کر سکتے، پھر اس ایجاز و اختصار میں ایسی قوت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، اس کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا، ان کے ایجاز و اختصار میں جوش بھی ہوتا ہے، حسن بھی اور قطعیت بھی، اکرام صاحب پوچھنے لگے یہ کن صاحب کا تجزیہ ہے، میں نے عرض کیا، ڈاکٹر سید عبداللہ کا،

انھوں نے کہا کہ میں اس کو ضرور پڑھوں گا، میں ان کا مہمان تھا، اس لیے میری خاطر اس وقت ذرا کھل کر وہ گفتگو کرنے سے پرہیز کر رہے تھے۔ ان سے مل کر مجھکو یہ خیال ہوا کہ ان کی جیسی باوقار شخصیت کے قلم سے شبلی نامہ میں بعض ایسی بحثیں کیسے نکل پڑیں، جو انکی تصنیفی متانت کے لیے بھی کسی طرح موزوں نہیں ہیں، ان کی بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنی رائے میں ترمیم بھی کر لیتے ہیں، چنانچہ ان کی تصانیف کے دوسرے اڈیشن میں بہت کچھ ترمیمات ہو جاتی ہیں، وہ شبلی نامہ کا دوسرا اڈیشن شائع کرینگے تو امید ہے کہ اس کے طرز ا لب لہجہ میں فرق آجائیگا، بلکہ انکی بہت سی رائیں بھی بدلی ہوئی ہوں گی، حیات شبلی کا ذکر آیا تو سر سید کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کو اتفاق نہ تھا، اور میں نے محسوس کیا کہ اس سلسلہ میں ان کو آزردگی بھی تھی، میں نے عرض کیا کہ آپ یہی کہیں گے کہ سید صاحب نے مولانا شبلی کو سر سید سے زیادہ بڑھایا ہے، تو اسی سرزمین پنجاب کے ایک بہت بڑے بزرگ حضرت زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ سماعت فرمائیں، انھوں نے بغداد جا کر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے فیوض حاصل کیے اور وہاں ان ہی سے خرقۂ خلافت پایا، جب وہ اپنے مرشد سے رخصت ہونے لگے تو حضرت جلال الدین تبریزی بھی ان کے ساتھ ہو گئے، جو ان دنوں وہیں مقیم تھے، جب یہ دونوں بزرگ نیشاپور پہنچے تو حضرت جلال الدین تبریزی، حضرت شیخ فریدالدین عطار کی خدمت میں تشریف لے گئے ان سے مل کر واپس ہوئے تو حضرت بہاء الدین زکریا نے ان سے دریافت کیا کہ شیخ فریدالدین سے کیا کیا صحبت رہی، انھوں نے جواب دیا کہ انھوں نے پوچھا کہ بغداد میں کون درویش مشغول بحق ہے، مگر میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، حضرت بہاء الدین زکریا نے ان سے کہا کہ اپنے مرشد شیخ الشیوخ شہاب الدین کا کیوں ذکر نہیں کیا، حضرت جلال الدین تبریزی نے جواب دیا کہ شیخ فریدالدین کی عظمت میرے دل پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کو بھول گیا، یہ سن کر شیخ بہاء الدین زکریا کو بہت ملال ہوا، اور انھوں نے کہا کہ تم دوسروں کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے شیخ کو بھول سکتے ہو تو

ہماری تمہاری راہیں آج سے الگ ہیں، وہ ملتان چلے آئے اور حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے دوسری راہ لی، اس روایت کو بیان کر کے میں نے عرض کیا کہ سید صاحب اور ان کی طرح ہم لوگوں کا بھی یہی مسلک ہے کہ دوسروں کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے مرشد اور استاد کی عظمت ہی کو برتر سمجھتے ہیں، خواہ آپ کو یا کسی اور کو اس عقیدت کے پہلو سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، اکرام صاحب میری بیان کردہ روایت کو سنکر ہنسنے لگے، پھر میں نے عرض کیا کہ عقیدت بھی اپنی جگہ پر اور اس سے ناقدوں کا اختلاف بھی اپنی جگہ پر، میں نے یہ بھی عرض کیا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حیات شبلی لکھتے وقت سید صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتا، ان قیمتی آنسوؤں کے بعد عقیدت کی فراوانی وہی ہونی چاہیے جو حیات شبلی میں پائی جاتی ہے، اکرام صاحب نے میری ان باتوں کو غور سے سنا اور شاید ان پر اپنے اصلی خیالات کا اظہار کر کے الجھنا پسند نہیں کیا کہ میں ان کا مہمان تھا۔

ان سطروں کو لکھتے وقت کچھ اور باتیں لکھنے کو جی چاہتا ہے، گو خاموش رہنا ہی زیادہ بہتر تھا لیکن اکرام صاحب کی ملاقات کے بعد ان کی نوازشوں سے سیراب ہونے کے بعد خواہ مخواہ لکھ رہا ہوں کہ انھوں نے شبلی نامہ میں لکھا ہے کہ شبلی اور سرسید کے متعلق انھوں نے (مولانا سید سلیمان ندوی نے) جس انداز سے بحث کی ہے اس سے ہمارے خیال میں شبلی کو بجائے فائدے کے نقصان ہوگا، (ص ۱۱) اکرام صاحب کو اگر مولانا شبلی کو نقصان پہنچنے کے بجائے ان کے فائدے کا واقعی خیال ہے تو اس کا فیصلہ کہ شبلی نامہ سے مولانا شبلی کو نقصان پہنچا ہے یا فائدہ، وہ خود نہیں فرما سکتے، بلکہ اس کتاب کے ناظرین ہی کر سکتے ہیں، اسکے علاوہ کبھی انھوں نے اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق اور وحید قریشی نے مولانا شبلی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے مولانا شبلی کو نقصان پہنچا ہے یا فائدہ،

حیات شبلی میں سید صاحب نے مولانا شبلی اور سرسید کے اختلافات کی تفصیل ضرور لکھی ہے جو کوئی نئی بات نہیں ہے، سرسید کی زندگی میں لوگوں نے ان سے جس طرح اختلاف کیا تھا، وہ صرف مخالفت ہی

جون ۷۰ء

کی حد تک نہیں رہی، بلکہ ان پر کفر کا فتویٰ بھی دیا گیا، ان کے بعض بہت ہی معتمد ساتھیوں کو بھی ان سے اختلاف ہو گیا تھا، حالی نے حیات جاوید میں سرسید کی مخالفت کا ایک مستقل باب ہی قائم کیا ہے، اس سے سرسید کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا، سرسید کے خیالات سے اختلاف کی صدائے بازگشت اور ان پر تنقیدیں تو اس دور میں اب بھی سنائی دیتی ہیں، اور خود علی گڑھ کے حلقہ سے بھی مولوی طفیل احمد منگلوری نے "مسلمانوں کے روشن مستقبل" میں کیا کچھ نہیں لکھا ہے، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہتے ہیں، وہاں وہ کچھ دنوں استاد بھی رہ چکے ہیں، وہ اپنی تصنیف "ہندستانی مسلمان آئینۂ ایام میں" میں لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانہ میں سرسید بجنور میں صدر امین تھے، وہ نہ صرف سرکاری ملازم کی حیثیت سے انگریزی حکومت کا وفادار رہنا اپنا فرض سمجھتے تھے، بلکہ انھیں دل سے یقین تھا کہ اس حکومت کا قائم رہنا ہندوستان میں امن قائم کرنے کے لیے اور اسے خوشحال اور ترقی کی راہ دکھانے کیلئے ضروری ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس کا ساتھ دیا۔" (ص ۱۳۶)

"وہ سچا مذہبی جوش رکھتے تھے، مگر ان کا دین مذہب کی طرف زیادہ ذہنی تھا، اور اس میں خالص روحانی عنصر بہت کم تھا، وہ ہندوؤں، عیسائیوں اور دوسرے مذہب کے لوگوں کے ساتھ سچی رواداری برتتے تھے، مگر یہ صوفیوں کی قلبی رواداری تھی نہ جدید جمہوریت پسندوں کی ذہنی رواداری بلکہ محض ہندوستانی تہذیب کی روایتی رواداری، وہ روشن خیال اور ترقی پسند تھے، مگر کچھ حد کے اندر، انھیں ہندوستانی سماج کی جہالت، تنگ نظری اور قوم پرستی کا احساس تھا، اور اسکی اصلاح کرنا چاہتے تھے، مگر اسکے بنیادی جاگیرداری ڈھانچے کو بدلنے کو تیار نہ تھے۔" (ص ۵۳-۵۲)

"مسٹر بیک نے انکو اس پر راضی کر لیا کہ محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن قائم کیجائے جس کے مقاصد میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا، انکو سیاسی شورش سے دور رکھنا اور

سلطنت برطانیہ کے استحکام اور حفاظت میں مدد دینا سب سے اہم تھا۔ ...... یہ انجمن مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھنے میں کامیاب نہیں رہی مگر پھر بھی مسلمانوں کے ایک حلقہ کے دلوں میں فرقہ وارانہ سیاست کا بیج جو اس نے بویا تھا، بہت جلد جڑ پکڑ لی۔" (ص ۶۰)

"محمڈن ایسوسی ایشن سر سید کے بڑھاپے کی کمزور اولاد تھی جس نے اگلے ۱۹۰۶ء میں مسٹر بک کے انتقال کے ساتھ دم توڑ دیا، مگر فرقہ پروری کا وہ بیج بو گئی جو چھ سال بعد مسلم لیگ کی شکل میں پھوٹنے والا تھا۔" (ص ۶۱)

انجمن ترقی اردو کے مرکزی دفتر سے اس کا ہفتہ وار آرگن ہماری زبان کے نام سے علی گڑھ سے نکلتا ہے، ۲۲ اپریل ۱۹۷۰ء کی اشاعت اس وقت سامنے ہے، اس کے اڈیٹر ڈاکٹر مسعود حسین مسلم یونیورسٹی کے ایک ممتاز اور لائق استاد ہیں، وہ اس کے اداریہ میں لکھتے ہیں:۔

"علی گڑھ اور اردو کا رشتہ محبت و نفرت، لاگ اور لگاؤ کی ایک دلچسپ اور عبرت ناک کہانی ہے، علی گڑھ نے اردو کو ہمیشہ سرنگوں رکھا اور اردو نے علی گڑھ کو ہمیشہ سرفراز رکھا۔ سر سید اور علی گڑھ کی تحریک کا تصور اردو کے بغیر نہیں کیا جا سکتا، ۱۸۶۹ء تک سر سید نے مسلسل اردو یونیورسٹی کا خواب دیکھا، اور سائنٹفک سوسائٹی جس کا مقصد اردو کو علمی تراجم سے مالامال کرنا تھا، اس کے روح رواں بنے رہے، لیکن یورپ سے واپس آنے کے بعد ۱۸۷۰ء میں انھوں نے سید محمود کی اعانت سے اپنی تعلیمی اسکیم مرتب کی تو اس وقت تک ان کا ورناکولر یونیورسٹی میں ایمان متزلزل ہو گیا تھا۔ علی گڑھ میں انگریزی کے ساتھ ایک اردو فیکلٹی کا قیام عمل میں آیا لیکن اس طرح کہ وہ سسک سسک کر چند سال جینے کے بعد ۱۸۷۷ء میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی، اس کے بعد سر سید اس نقطۂ نظر کے قائل ہو گئے تھے کہ یہ خیال بہت پرانا ہے کہ اگر ہماری تعلیم ہماری زبان میں ہو تو ہمارے لیے اور ملک کی ترقی کے لیے زیادہ مفید ہے، اب سر سید نہ صرف مشرقی علوم دانستہ

کی تحصیل کرنے والوں کو فاتحہ کی روٹی کھانے والے کہتے تھے، بلکہ اردو زبان کو صرف تحصیلی اور دیہاتی مکتبوں کی تعلیم کے لیے محدود رکھنا چاہتے تھے، اس کے بعد علی گڑھ کی چہار دیواری میں کیا سر سید اردو کے لیے کچھ نہ کر سکے"۔

سر سید کے متعلق اس قسم کی اور بھی بہت سی تحریریں دوسرے اہل قلم کے یہاں بھی ملیں گی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے "سر سید اور اصلاح معاشرہ" کے نام سے جو کتاب شائع ہوئی ہے، اس میں بھی سر سید کے "افکار و نظریات میں چند نقائص" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، گو یہ بہت اجمالی ہے (ص ۲۵۳) سر سید کی مخالفت میں ان کی زندگی سے لیکر اب تک جتنی تحریریں نکلی ہیں ان کو پڑھنے کے بعد حیات شبلی میں سر سید اور مولانا شبلی کے جو اختلافات دکھائے گئے ہیں، وہ بہت سنگین نظر نہ آئیں گے، اس سے قطع نظر ان کو قلمبند کرنے میں کہیں بھی نامناسب الفاظ اور جملے نہیں لکھے گئے ہیں، جو شبلی نامہ میں بعض جگہوں پر مطالعہ کرنے میں آتے ہیں، اس کے لائق مصنف کو اعتراف ہے کہ "آپ (حیات شبلی کے) مؤلف کی ایک آدھ بات سے اختلاف کر لیں لیکن اس میں جو ذخیرۂ معلومات جمع ہے، اس کی قدر نہ کرنا بے انصافی ہے، اگر آپ اسے کامل سوانح عمری نہ بھی سمجھیں اور کڑے نقطۂ نظر سے آخر ہماری زبان میں کتنی کامل سوانح عمریاں ہیں، تب بھی حیات شبلی میں فاضل مؤلف نے ہماری تیس چالیس سال کی مکمل علمی، ادبی اور مذہبی تاریخ جس طرح پیش کی ہے، اور یادش بخیر یورپ کی کوئی سات سو سال کی علمی تاریخ لکھ دی ہے، اس کے احسان سے کس طرح انکار ہو سکتا ہے"۔ (شبلی نامہ ص ۱۲)

اب شبلی نامہ کے فاضل مولف کو یہ غور فرمانا ہے کہ وہ حیات شبلی کی ایک آدھ بات سے اختلاف اور شدید اختلاف کرنے میں اپنی علمی سرگرمیوں کا مصرف لیں یا اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو مفید، مفید تر، بلکہ مفید ترین علمی کاموں میں صرف کر کے علم، ادب اور تاریخ کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کریں۔

میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں اکرام صاحب سے رخصت ہونے لگا تو ان سے ان کی مشہور کتاب

غالب نامہ کا تازہ اڈیشن مانگا، لیکن اس کے بجائے انھوں نے اپنی اور بھی مشہور تصنیف رود کوثر کا نیا اڈیشن میری قیام گاہ پر بھجوانے کا وعدہ فرمایا، اکرام صاحب کے ساتھ ادارہ کے اور لوگوں سے ملاقات کرنے کا بھی موقع ملا۔ اس وقت پروفیسر حمید احمد خاں صاحب بھی تھے، جو پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، اب اس ادارہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں۔ ان کی خوبیاں کراچی میں سن چکا تھا، اس لیے ان سے شوق سے ملا۔ میں نے ان کا ایک مضمون "غالب کی شاعری میں حسن و عشق" بہت غور سے پڑھا ہے۔ اس کے کچھ خیالات سے اتفاق نہیں ہے، خصوصاً ان کی اس رائے سے تو میرے ساتھ اور لوگوں کو بھی اختلاف ہوگا کہ غالب کا کلام اسلامی ہندوستان کی سماجی اور روحانی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ان سے پوچھوں کہ یہ انھوں نے جوشِ عقیدت میں لکھا ہے یا واقعی انکی یہ رائے حقیقت پر مبنی ہے، لیکن وہ اس محبت سے پیش آرہے تھے کہ اس بحث میں پڑنے کا موقع نہ تھا۔ انھوں نے غالب کے نسخۂ حمیدیہ کو پھر سے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے، اس کا ایک نسخہ مجھکو بھی عنایت فرمایا، یہ بہت عمدہ کاغذ پر دیدہ زیب گرد پوش کے ساتھ عمدہ ٹائپ میں چھپا ہے۔ غالب کو اپنی زندگی میں ہمیشہ دکھ رہا کہ ان کے دیوان کی طباعت ان کی خواہش کے مطابق کبھی نہیں ہوئی، اس لیے وہ دلی اس کے بانی اور اس کے چھاپے خانے پر لعنت بھیجتے رہے۔ ان کی روح مولانا امتیاز علی عرشی کے اس اعلیٰ اڈیشن کی طباعت سے خوش ہوئی ہوگی، جو انھوں نے ۱۹۴۲ء میں انتخاب غالب کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد وہ عالم بالا میں پروفیسر حمید احمد خاں کے اس اڈیشن سے بھی خوش ہو رہے ہونگے، پروفیسر صاحب نے اپنے دیباچہ میں مفتی انوار الحق کے ترتیب دیے ہوئے نسخۂ حمیدیہ کو یہ لکھ کر مجروح کیا ہے کہ ۱۹۲۱ء کا نسخۂ حمیدیہ بھوپال کے قلمی دیوان کی پہلی مطبوعہ نقل ہے، افسوس ہے کہ قلمی دیوان کے انحراف کی جتنی مختلف قسمیں تصور میں آسکتی ہیں وہ مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخہ میں موجود ہیں۔ مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخے میں نہ صرف بعد کی سب اصلاحیں ہیں، بلکہ وہ پوری کی پوری غزلیں بھی شامل ہیں جنکا

بھوپال کے مخطوطے میں سرے سے وجود ہی نہیں (دیباچہ ۲۲) وہ مفتی صاحب کے نسخے کے متعلق یہ بھی لکھتے ہیں کہ مطبوعہ نسخے میں ایک بڑا فتور یہ پیدا ہوا ہے کہ قلمی نسخے میں غزلیات کی ترتیب مطبوعہ نسخے تک پہنچتے پہنچتے کچھ کی کچھ ہوگئی ہے (ص ۲۱) پروفیسر صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ مطبوعہ نسخہ متعدد فرد گذاشتوں کی وجہ سے وہ مقصد کما حقہ پورا نہ کر سکا جو اسے کرنا چاہیے تھا مفتی صاحب کے نسخہ پر بعض سخت جملے پروفیسر صاحب کے قلم سے نہ نکلتے تو زیادہ مناسب تھا، کیونکہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کے دریافت نے اس زمانہ کے ادبی حلقوں میں سنسنی سی پیدا کر دی، اس سنسنی پیدا کرنے میں مفتی صاحب کا بڑا حصہ ہے، گذشتہ پچاس برس سے غالب پر جس نے بھی کچھ لکھا ہے، اس نسخہ کو ضرور سامنے رکھا ہے، خود پروفیسر صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ قلمی دیوان کے پیش نظر ہوتے ہوئے مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخہ پر تکیہ ناگزیر ہے (ص ۲۲) انھوں نے اپنے نسخہ کی تیاری میں مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخہ کے متن کو بنیادی متن قرار دیا ہے (ص ۲۲) یہ اور بات ہے کہ پروفیسر صاحب کے ایڈٹ کرنے کا طریقہ ان سے زیادہ بہتر ہے، مگر اس سے مفتی صاحب کی محنت رائگاں قرار نہیں دی جا سکتی ہے، ممکن ہے کہ آئندہ نسخۂ حمیدیہ کو کوئی اور بہتر طریقہ پر ایڈٹ کر دے اور وہ پروفیسر صاحب کی محنت اور مشقت پر پانی پھیرنے کی کوشش کرے تو کیا یہ اس کا ستم نہ ہوگا، مفتی صاحب کے نسخۂ حمیدیہ میں پروفیسر صاحب کو کتابت کی بہت سی فرو گذاشتیں نظر آئیں، لیکن خوش قسمت غالب کی یہ بد قسمتی رہی کہ ان کے اشعار کی کتابت کے وقت بکثرت غلطیاں رہ جاتی ہیں، جیسا کہ پروفیسر صاحب کو بھی تجربہ ہے، کیونکہ ان کو اپنے نسخہ کے آخر میں ۱۵ صفحے کا غلط نامہ لگانا پڑا ہے، ان باتوں سے قطع نظر پروفیسر صاحب نے یہ دیوان ایڈٹ کر کے غالب کے پرستاروں کو ایک بہت ہی خوبصورت تحفہ عطا کیا ہے۔ غالب کے صدسالہ جشن کے موقع پر شاید اس سے بہتر دیوان کہیں اور نہیں چھپا، یہ مجلس ترقی ادب، ۲۔ کلب روڈ لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے، اس کی قیمت پندرہ روپے ہے،

پروفیسر حمید احمد خاں نے دیوان غالب کا مطبوعہ نسخہ شیرانی بھی عطا کیا، اس کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ یہ نسخہ حمیدیہ کے بعد مرتب ہوا، اس لیے اس میں غالب کا وہ کلام بھی ہے جو نسخہ حمیدیہ میں نہیں تھا، یہ حافظ محمود خاں شیرانی کے ذخیرۂ کتب میں تھا، جو اب پنجاب یونیورسٹی لاہور کی ملکیت ہے، اس کو مجلس ترقی ادب لاہور نے فوٹو آفسٹ میں شائع کرکے غالب کے صد سالہ جشن کے موقع پر عقیدت کا ایک نذرانہ پیش کیا ہے، اس کے بعد غالبیات پر کام کرنے والوں کو اصل نسخہ دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی، غالب کے کلام کے اور نسخوں کے ساتھ اس خوبصورت نسخہ کا رکھنا ناگزیر ہے، اسکی قیمت بھی پندرہ روپئے ہے،

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے رفیق مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی نے مجھکو اپنی طرف بہت کھینچا، کیوں؟ اسکی وجہ میں نہیں بتا سکتا، وہ اب تک بہت سی کتابوں اور رسالوں مثلاً "الدین یسر"، "ریاض السنہ"، "پیغمبر انسانیت"، "ازدواجی زندگی کے لیے قانونی تجاویز"، "مسئلہ تعدد ازدواج"، "تحدید نسل"، "اجتہادی مسائل"، "زیردستوں کی آقائی"، "الفخری" وغیرہ کے مصنف اور مترجم ہو چکے ہیں، وہ ادارہ کے اہم مصنف ہیں، اس کے منجملہ مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اسلام کی ایسی ترقی یافتہ تعبیرات پیش کیجائیں جو ماضی کی وابستگی کے ساتھ حال کی ترقیوں پر بھی حاوی ہو، اور اسی روشنی میں روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والے فقہی مسائل کی جدید تدوین کیجائے، اس مقصد کی تکمیل میں مولانا شاہ محمد جعفر کا قلم بہت ہی سرگرم ہے، وہ دین میں عسر (دشواری) کے بجائے یسر (آسانی) چاہتے ہیں، وہ فروع پر زیادہ زور دے کر اصل اصول کو گم کرکے عقلی و نقلی گنجایشوں سے فائدہ اٹھانے کے قائل ہیں، وہ اسلام کی اسپرٹ کو ہر حال میں برقرار رکھنے کی تلقین کرتے ہیں، لیکن اس کے بعض قوانین میں ترمیم اور تبدیلی بھی چاہتے ہیں، وہ اجتہاد کے دروازے کو ہمیشہ کھلا رکھنے اور جدید فقہ کے تدوین کرنے کے داعی ہیں، اسی اجتہاد کے خیال سے انھوں نے جہاں اور اہم مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے، وہاں کچھ ایسی

باتیں بھی پیش کی ہیں جن سے بعض حلقوں میں ہلچل پیدا ہوگئی ہے، مثلاً انھوں نے اپنی تحریروں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر کوئی شخص عربی الفاظ عمدگی سے نہ ادا کر سکتا ہو اور عربی زبان سمجھنے پر قادر نہ ہو تو وہ اپنی مادری زبان میں نماز ادا کر سکتا ہے (الدین یسر، ص ۳۰۶) ان کا خیال ہے کہ مالِ زکوٰۃ کی تعیین، نصاب کا اندازہ، زکوٰۃ کی مقدار وغیرہ مصالح انسانی کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہو سکتا ہے، انسانی فائدے اور اجتماعی مفاد پر روزے کو قربان کیا جا سکتا ہے، (الدین یسر، ص ۳۳۱)، رویت ہلال کا مسئلہ فلکی حساب کے مطابق طے کیا جا سکتا ہے، مومنہ کا نکاح کتابی مرد سے ہو سکتا ہے (ایضاً ص ۱۷۳) وہ وراثت کے اسلامی قانون میں بھی تبدیلی کے خواہاں ہیں، ان کی یہ بھی رائے ہے کہ اگر کوئی اسلامی حکومت مصالحِ امت کے پیش نظر اپنی مملکت میں آج تعدد ازدواج ممنوع قرار دیدے تو اسے اس کا پورا حق حاصل ہے، یہ کوئی مداخلت فی الدین نہیں، لیکن اگر حالات بدل جائیں اور مصالحِ امت تعدد کے متقاضی ہوں تو پہلا حکم منسوخ کرنے کا بھی اس حکومت کو اختیار ہے، وہ کسی کمپنی یا بینک کے کمرشل انٹرسٹ کو ربوا قرار دینے کے لیے تیار نہیں ہیں، کیونکہ اس میں ربوا کی اسپرٹ نہیں پائی جاتی، الخ الخ

ان کی اس قسم کی جتنی تحریریں نکلی ہیں، اُن میں اختلاف کی پوری گنجایش ہے، قلم کا جادو بھی عجیب چیز ہے، اس کے زور سے بعض اوقات جس چیز کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے، اسی کو ناجائز بھی ٹھہرایا جا سکتا ہے، دینی اور فقہی مسائل میں تو یہ زور جانبین کی طرف سے ہر زمانہ میں دیکھا گیا ہے، خود مولانا کو اعتراف ہے کہ فقہ جدید کی تشکیل کی طرف غالباً اس لیے بھی اقدام نہیں ہو سکا کہ یہ کام اتنا سہل نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے، اس میں بےشمار نزاکتیں ہیں، مولانا لکھنے کو تو سب کچھ لکھ گئے ہیں لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی، اسی کے ساتھ وہ اپنے ناظرین سے اس کے بھی ملتجی ہوئے ہیں کہ شریعت کو غیر متبدل نہ سمجھا جائے، بلکہ اس میں جو توسع اور تیسر

رکھا گیا ہے اسے آج بھی اور آئندہ بھی باقی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھایا جائے، ان کا خیال ہے کہ شریعت اپنے وقتی تقاضوں کے مطابق ہر جگہ ہیئت و شکل بدلتی رہتی ہے، اور اس تبدیلی سے اصل دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ مگر ان کو بھی اعتراف ہے کہ ان کے معترضین کہتے ہیں کہ ان کا ادارہ قائم بھی اس لیے ہوا ہے کہ وہ مغرب زدہ لوگوں کے رجحانات کی تائید میں اباحیت کا دروازہ کھول دے، سچ تو یہ ہے کہ جن مسائل پر مولانا لکھ کر اپنی تحریروں کو مالا مال کرتے رہتے ہیں وہ محض لکھنے سے سلجھ نہیں سکتے ہیں، کیونکہ ان کی رد میں بھی فکر و نظر کا انبار لگایا جا سکتا ہے، یہ سارے مسائل تو ایسے ہیں جو اجماع امت ہی کے ذریعہ سے طے ہو سکتے ہیں۔ اسلامی ممالک میں بات بات پر کانفرنسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں، حتیٰ کہ کلچر کے نام پر رقص و سرود پر بھی اسلامی کانفرنسیں ہو جاتی ہیں، لیکن جن حالات اور مسائل سے مسلمانوں کی شرعی اور دینی زندگی میں پراگندگی پیدا ہو گئی ہے، اور مسلمان اور اسلام دو متضاد چیزیں نظر آنے لگے ہیں، ان کو دور کرنے یا ان پر قابو پانے کے لیے اجماع امت کہیں نہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں ملیشیا میں بعض مسائل کو اجماع کے ذریعہ طے کرنے کی کوشش کی گئی تھی، لیکن اس کے ابھی خاطر خواہ نتائج ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ مولانا محمد جعفر پھلواروی جس ملک میں رہتے ہیں وہاں اسکا موقع ہے کہ علما، اور اہل الرائے جمع ہو کر ان تمام مسائل پر اپنے قطعی فیصلے صادر کر سکتے ہیں، جن کو مولانا ڈرتے اور ہچکچاتے ہوئے پیش کرتے رہتے ہیں، اور جن کو پڑھ کر انکے ناظرین رد و قبول کرنے کی کشمکش میں پڑ جاتے ہیں، ان کا خود بھی خیال ہے کہ اس قسم کے متنازع فیہ مسائل پر فیصلہ صادر کرنا ان کا کام نہیں، بلکہ ان کو ارباب حل و عقد ہی طے کر سکتے ہیں (الدین یسر، ص ۱۱۵)، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ارباب حل و عقد کہاں گم ہیں، ان کی دریافت کیسے ہو سکتی ہے، اور ہوگی بھی کہ نہیں یا صرف کتابیں ہی لکھ کر مسلمانوں کے عام ذہن کو کشمکش میں مبتلا کر دینے پر اکتفا کر لیا جائیگا۔

مولانا محمد جعفر پھلواروی نے لاہور میں میری قیام گاہ پر آکر اپنی دو تصانیف "اسلام اور موسیقی"

اور "مجمع البحرین" عنایت کیں، اور از راہ محبت کہا کہ میں ان دونوں پر خود ریویو لکھوں، میں کوئی عالم تو نہیں، اس لیے ان دونوں کتابوں پر کسی عالم کی رائے ہی قابل توجہ ہو سکتی ہے،

اسلام اور موسیقی کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا، دوسرے اڈیشن کی طباعت ۱۹۶۸ء میں ہوئی جس میں پہلے اڈیشن سے کچھ اور اضافے ہیں، مولانا نے اپنے دونوں اڈیشنوں میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ محدثین عام طور پر موسیقی کی اباحت کے قائل ہیں، فقہا اس کو حرام قرار دیتے ہیں، صوفیہ عام طور پر اس کو جائز سمجھتے ہیں، مگر اس کے لیے بہت کڑی شرطیں رکھی ہیں، تاکہ کوئی اس کا غلط استعمال نہ کر سکے۔ خود مولانا کا رجحان اس مسئلہ میں محدثین کے مسلک کی طرف ہے، حالانکہ وہ اپنی نظر و فکر میں اہل قرآن سے زیادہ قریب تر ہیں۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے، موسیقی مزامیر کے بغیر تو ہر زمانہ میں جائز قرار دی گئی ہے، لیکن مزامیر کی حرمت میں تو اکثر و بیشتر علماء اور فقہا متفق رہے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ موسیقی اور مزامیر کی حلت و حرمت پر ہر زمانہ میں ہر جگہ بحث ہوتی رہی ہے، مثلاً حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مشہور اور مستند مجموعۂ ملفوظات فوائد الفواد میں ہے کہ ایک مجلس میں ان کے مریدوں نے عرض کی کہ آجکل مخدوم کی خدمت کی خاطر ہر وقت سماع سننا جائز کر دیا گیا ہے۔ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ جو چیز حرام ہے وہ کسی کے کہنے سے حلال نہیں ہو سکتی اور جو چیز حلال ہے وہ کسی کے حکم سے حرام نہیں ہو سکتی، مثلاً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں سماع دف اور چغانہ کے ساتھ جائز ہے۔ ہمارے علماء (احناف) اس کے خلاف ہیں، لیکن اب اس اختلاف میں حاکم وقت کا جو حکم ہوگا وہی صحیح ہوگا، مریدوں میں سے کسی ایک نے گذارش کی کہ آجکل بعض خانقاہوں میں درویش چنگ و رباب و مزامیر کی محفل میں رقص کرتے ہیں، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ وہ اچھا نہیں کرتے، کیونکہ جو فعل نامشروع ہے، وہ ناپسندیدہ ہے، ...... یہ تمام باتیں معصیت کی ہیں (ص ۳۴۷)

ایک بار مجلس سماع ہوئی جس میں حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ بھی تھے، قوالوں نے جب

دف کے ساتھ گانا شروع کیا، تو حضرت چراغ دہلویؒ اٹھ کھڑے ہوئے، لوگوں نے بیٹھنے کی درخواست کی، تو فرمایا یہ خلافِ سنت ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کو یہ واقعہ سنایا گیا تو انھوں نے فرمایا وہ سچ کہتے ہیں، اور حق وہی ہے جو وہ کہتے ہیں، (اخبار الاخیار ص ۱۷۶)۔ ایک بار کسی نے مجلس سماع میں حضرت چراغ دہلویؒ سے مزامیر، دف، رباب کے متعلق استفسار کیا تو فرمایا، مزامیر تو بالاجماع مباح نہیں ہیں، اگر کوئی طریقت سے گرے تو کم از کم شریعت میں رہے، اور اگر شریعت کا بھی نہ ہوگا تو پھر کہاں کا رہے گا اور نجات کی کیا صورت ہوگی، اول تو سماع ہی میں علماء کا اختلاف ہے، اگرچہ کچھ شرائط کے ساتھ اسکو مباح کیا گیا ہے، لیکن مزامیر تو بالاتفاق حرام ہیں، (خیر المجالس مجلس ہشتم و اخبار الاخیار ص ۷۶) حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی وفات کو ساڑھے چھ سو برس گذر گئے، اس وقت بھی یہی بحث تھی، اور اب بھی یہی بحث ہے، اب اگر مولانا جعفر پھلواروی کو موسیقی اور مزامیر کی حلت پر اصرار ہے تو پھر وہ جہاں ہیں وہاں کے حاکم کا سہارا لے کر اس کو حلال قرار دے سکتے ہیں، ان کی یہ تصنیف بقول ان کے مینارہ کی روشنی تو بن سکتی ہے لیکن اس مسئلہ پر حرفِ آخر قرار نہیں دیجا سکتی ہے،

مولانا پھلواروی کی نئی تصنیف "مجمع البحرین" میں سنی اور شیعہ فرقوں کی متفق علیہ روایتوں کو جمع کرکے دونوں کے باہمی اختلافات اور منافرت کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، شیعہ سنی کا جھگڑا اسلامی تاریخ کا ایک دردناک بلکہ شرمناک پہلو ہے، ان سے امت مسلمہ کو غیر معمولی نقصان پہنچا اور پہنچ رہا ہے، مولانا کی یہ کتاب ان جھگڑوں کی تلخیوں کو دور کرنے میں ضرور مدد پہنچائے گی، اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سنیوں اور شیعوں کے اکثر مذہبی عقائد میں وحدت نہیں ہے، دونوں توحید، رسالت اور ارکان اسلام کے یکساں طور پر قائل نہیں ہیں، لیکن اس کو تسلیم کرنے کے باوجود ان میں جو منافرت ہے، وہ کیسے دور ہو سکتی ہے، اس کو بھی پیش

کرنے کی ضرورت ہے، اگر ان دونوں فرقوں کے جھگڑوں سے ان کی تاریخ داغدار ہے تو انکے تعاون اور اتحاد کی تاریخ بھی دلچسپ اور اہم موضوع ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے صفحات تو ان کے مشترک کاموں سے بھرے پڑے ہیں، اگر ان کو تلاش و تحقیق سے جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، ان کی تفصیلات پڑھ کر دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکتے ہیں، اسی کے ساتھ سنی اور شیعہ کے مریض فرقوں کو ان کا اصل مرض بھی بتانے کی ضرورت ہے، ذرا بہت ہی صاف صاف یہ لکھنے میں اس وقت تامل نہیں ہو رہا ہے کہ شیعہ سنی میں اختلاف کا سب سے بڑا سبب تبرا بازی ہے، اور سنی جس طرح اس کا جواب دیتے ہیں وہ بھی کوئی اچھی صورت نہیں، کسی کی غیر رواداری کا جواب غیر رواداری سے دینا اخلاق کی بلندی نہیں ہے، دونوں کو اس سلسلہ میں اپنی اپنی کم نظری اور بے بصری پر نظر ثانی کرنا لازمی ہے، اگر شیعے گھروں میں بیٹھ کر تبرا کریں تو سنیوں کو کوئی شکایت نہ ہونی چاہیے، شیعی مورخوں میں مسعودی، یعقوبی اور الفخری نے خلفائے ثلاثہ کی دینی حیثیت کو تو نہیں لیکن ان کی تاریخی عظمت کا اعتراف کر لیا ہے، اسی طرح عام شیعے تبرا کہنے کے باوجود ان کی تاریخی عظمت کا اعتراف کر لیں تو پھر دونوں کے درمیان بہت سی تلخیاں دور ہو جاتی ہیں، ان فروعی باتوں پر جھگڑنا انسانی نادانی بلکہ ملی خودکشی ہے، آخرت میں کسی شیعہ سے یہ پرسش نہ ہوگی کہ اس نے تبرا کیوں نہیں کہا، اور نہ کسی سنی سے یہ بازپرس ہوگی کہ اس نے تبرا کیوں نہیں روکا، لیکن اس کی پرسش دونوں سے ضرور ہوگی کہ آپس میں لڑ کر امت مسلمہ کو نقصان پہنچایا، ان سطروں کے لکھتے وقت دہلی سے رسالہ اسلام اور عصر جدید پہنچا، اسکے شروع میں اس کے مشہور اڈیٹر ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا "مسلمانوں کا اتحاد" کے عنوان سے ایک طویل اداریہ ہے، انھوں نے اس کے آخر میں شیعہ سنی اتحاد کی اپیل کرتے ہوئے صفی لکھنوی کا یہ شعر لکھا ہے ؎

ایسے محل پہ دوستو رخنہ گری ہے خودکشی
ہم بھی اسی جہاز میں تم بھی اسی جہاز میں

اس شعر کے اجمال کی تفصیل مولانا محمد جعفر پھلواروی کی کتاب میں ملے گی جس کے متعلق پاکستان کے ایک شیعی عالم حجۃ الاسلام علامہ مفتی جعفر حسین نے لکھا ہے کہ اس کتاب کی بعض باتیں دونوں فریقوں یا کسی ایک فرقہ کے ہاں متروک العمل ہیں لیکن امید ہے کہ یہ خدمت اتحاد اسلامی کے استحکام اور منافرت کے ختم ہونے کا باعث ہو،

مولانا محمد جعفر پھلواروی سے ملنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ جس طرح بولتے ہیں، اسی طرح لکھتے بھی ہیں، ان کی ملاقات کے بعد اب جب ان کی تحریریں پڑھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھ نہیں رہے ہیں بلکہ سامنے بیٹھ کر بول رہے ہیں، وہ فطری طور پر بڑے باغ و بہار ہیں جس کا رنگ ان کی تحریروں میں بھی آجاتا ہے، لکھتے وقت ان کے ذہن میں کوئی بے تکلف یا چست فقرہ آجاتا ہے تو پھر اس کو اسی طرح لکھ دیتے ہیں جس طرح اپنے بہت ہی بے تکلف احباب سے گفتگو کرتے وقت بول جاتے،

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے ایک اور اہم مصنف مولانا محمد حنیف ندوی نے اپنی تمام تحریریں شوق سے دکھلائیں، وہ دار المصنفین آچکے ہیں، ندوی بھی ہیں، اس لیے دار المصنفین کے ایک خدمتگذار کی طرف ان کی لپک فطری تھی، انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ امام غزالی کی تعلیمات اور ابن خلدون کے افکار کی بڑی ترویج کی ہے، امام غزالی کی المنقذ کا اردو ترجمہ سرگذشت غزالی کے نام سے کیا ہے، پھر ابن خلدون کے تنقیدی، عمرانی، دینی اور علمی خیالات کا تجزیہ اپنی کتاب افکار ابن خلدون میں کیا ہے، ان کے علاوہ علامہ ابو الحسن اشعری کی مقالات الاسلامیین کا ترجمہ مسلمانوں کے عقائد و افکار کے نام سے کیا ہے، ان کی یہ تمام کتابیں ان کے ادارہ سے شائع ہو چکی ہیں، ان کے مذہبی خیالات ان کی کتاب مسئلۂ اجتہاد سے معلوم ہوں گے، وہ بھی بدلتے ہوئے زمانہ کے ساتھ اسلام کے مروجہ شرعی اور فقہی مسائل میں اجتہاد کے لیے مصر ہیں، مگر اس طرح کہ ایک طرف تو وہ دلنشین قانونی پیرایۂ بیان کے حامل ہوں، اور دوسری طرف ایسے مرتب اور جچے تلے ہوں کہ کسی طرح بھی عصری

قوانین ان سے فائق مرتبہ کے نہ ٹھہرائے جائیں (مسئلۂ اجتہاد ص ۱۶۲)، ایسی اجتہادی کوششیں عمل میں آجائیں تو پھر مسلمانوں کا مستقبل کیسا روشن نظر آئے،

اس ادارہ کے رفقا میں شاہد حسین رزاقی صاحب نسبتاً کم عمر نظر آئے، یوپی کے رہنے والے تھے، حیدرآباد میں تعلیم پائی، اب پاکستانی ہیں، ان کی تحریریں صاف سلیس اور دلنشین ہوتی ہیں، خدا کرے وہ اپنے سلجھے انداز بیان سے اعلیٰ قسم کی علمی خدمات میں لگے رہیں، انھوں نے اپنی تصنیف تاریخ جمہوریت میں جمہوریت کے فکری اور عملی ارتقا کے ساتھ اسلام کی نظری اور عملی جمہوریت کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے، ان کی ایک تصنیف سرسید اور اصلاح معاشرہ بھی ہے جس میں سرسید کی معاشرتی، تعلیمی، تمدنی، اخلاقی، دینی اور مذہبی اصلاحات کی کوششوں کا بڑا اچھا تجزیہ ہے، سرسید پر جو اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان ہی میں اس کا بھی شمار ہوگا، ان کی ایک اچھی تصنیف "انڈونیشیا" بھی ہے، جس میں اس ملک کی مفید اور تاریخی معلومات فراہم کر دی گئی ہیں،

محمد اسحاق بھٹی صاحب بھی اب اس ادارہ کے رفیق ہیں، پہلے الاعتصام کے اڈیٹر تھے، وہ بھی زیادہ عمر کے نہیں معلوم ہوئے، انھوں نے ابن ندیم کی الفہرست کا اردو ترجمہ کیا ہے، جو چھپ کر تیار ہے،

محمد سرور صاحب جامعی بھی اب اس ادارہ سے وابستہ ہو گئے ہیں، ان سے ۱۹۲۳ء میں جامعہ ملیہ دہلی میں ملتا رہا تھا، تقریباً ۴۰ برس کے بعد پھر ملاقات ہوئی، ان پر کبر سنی کے زیادہ آثار نہیں پائے، وہ غالباً ۱۹۲۹ء میں جامعہ سے فارغ ہوئے، جس کے بعد جامعہ ازہر قاہرہ چلے گئے، وہاں سے واپسی کے بعد جامعہ ملیہ ہی کی خدمت کرنے میں مشغول ہو گئے، پھر ڈاکٹر ذاکر حسین کے مشورے سے مولانا عبید اللہ سندھی کے پاس مکہ معظمہ چلے گئے، ان کا خود بیان ہے کہ وہ ان دنوں تشکک اور یقین کے ملے جلے جذبات سے دبے ہوئے تھے، لیکن مولانا کی صحبت میں ان کے ذہن کی بہت سی گرہیں

کھل گئیں، وہ ان کی وفات تک ان کے ساتھ رہے، مولانا نے لاہور میں سندھ ساگر اکاڈمی قائم کی تو اس کے روح رواں سرور صاحب ہی رہے، مولانا شاہ ولی اللہ کے بڑے قائل تھے، ان کی تصانیف میں انسانیت کے تمام تقاضوں کا حل اور مداوا پاتے تھے، ان کا خیال تھا کہ انکی مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں اسلامی شریعت اور انسانی دوستی کے تمام اصولوں کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ وہ اس کتاب کی تعلیمات کی ترویج ہندوستان میں کرنا چاہتے تھے۔ ان میں قوت گویائی تو تھی لیکن تحریری قوت نہ تھی، اس لیے جب سرور صاحب ان کو مل گئے تو اپنے افکار شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں قلمبند کرانا شروع کیا، سرور صاحب نے بھی اپنے کو مٹا کر انکا ساتھ دیا، مولانا اب اس دنیا میں نہیں ہیں، لیکن وہ اس برصغیر میں سرور صاحب کے قلم ہی کے ذریعہ سے زندہ ہیں، ان کی کتاب "مولانا عبید اللہ سندھی" میں مولانا کے حالات کے ساتھ ان کی تعلیمات اور سیاسی افکار کا بہت اچھا تجزیہ ملے گا۔ اس کے ناظرین کو مولانا کے افکار سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن سرور صاحب نے جس ٹھنڈے، سلجھے اور منجھے ہوئے طرز میں پیش کیا ہے، ان سے ان کے قلم کی قوت سنجیدگی اور اثر پذیری کا ضرور اندازہ ہوتا ہے، وہ مولانا محمد علی کی ہمہ گیر، فعال اور سراپا عمل شخصیت اور ان کی وسیع اور نوع بہ نوع سرگرمیوں سے بھی متاثر رہے، جیسا کہ ان کی کتاب مولانا محمد علی سے ظاہر ہے۔ وہ ان کو تاریخ اور تاریخ ساز دونوں بتاتے ہیں، اس میں انھوں نے مولانا محمد علی سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا ہے، جس کو قلمبند کرنے میں ان کی تحریروں میں شگفتگی بھی ہے توازن بھی اور تاثیر بھی، امید ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی نمایاں خدمت کرنے میں ہر طرح پیش پیش رہیں گے۔

اس ادارہ کے سکریٹری محمد اشرف ڈار صاحب سے بھی مل کر خوشی ہوئی، وہ پہلے نشر و اشاعت کے ایک ادارہ Orientalia کے مالک تھے، انھوں نے خود یا دلایا کہ میں نے

استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کے رسالہ خواتین اسلام کی بہادری کا جو انگریزی ترجمہ کیا تھا، اس کی طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں ان سے کافی خط و کتابت رہی تھی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی عمارت لاہور کے بہترین حصہ کلب روڈ میں شہر کے ہنگاموں سے دور، درختوں، پھولوں اور سبزہ زاروں کے بیچ میں واقع ہے، اس کی فضا دارالمصنفین سے ملی جلی معلوم ہوئی۔ اس کی طرف سے انگریزی میں بھی کتابیں شائع ہوا کرتی ہیں جن کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہوگئی ہے، ان میں پروفیسر محمد شریف، ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، بشیر احمد ڈار، مظہر الدین صدیقی، افضل اقبال اور ڈاکٹر محمد یوسف کی بھی تصانیف ہیں، اردو میں یہاں سے پانچ درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جو مجموعی حیثیت سے ایک بڑا اور قابل قدر کارنامہ ہے، ان سے پاکستان کے لوگوں کے علمی، ذہنی اور مذہبی نشو و نما میں بڑی مدد ملتی رہے گی۔ پہلے ذکر آیا ہے کہ یہ ادارہ اسلام کی ترقی یافتہ تعبیرات بھی پیش کرنے میں لگا ہوا ہے، یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کو گرد و پیش کی دنیا سے بالکل بے خبر نہیں رہنا چاہیے، دنیا میں جو سیاسی، معاشی اور ذہنی انقلابات ہو رہے ہیں، ان کو نظر انداز کر کے ماضی کی عظمت اور روایت سے چمٹا رہنا درست نہیں، لیکن اگر قدامت پسندی میں تاریک پہلو ہیں تو تجدد پسندی میں بھی بڑے خطرات ہیں، قدامت پسندی کی تو ایک حد متعین ہو چکی ہے، لیکن تجدد پسندی کی حد کی کوئی انتہا نہیں، اگر تقلید پسندی کے تاریک پہلو دور کرنے کے بعد ہماری زندگی زمانہ کے ساتھ، رواں دواں بن سکتی ہے تو یہ بھی احتمال ہے کہ تجدد پسندی کا جو سیلاب آئیگا اس سے معلوم نہیں اسلام اپنی اصلی صورت کے بجائے کس شکل میں دکھائی دے گا، ادارہ کے ارباب حل و عقد کو ان پیچیدگیوں کا ضرور احساس ہوگا، ان کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت نہیں۔

جس روز ادارۂ ثقافت اسلامیہ گیا، اسی روز شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب سے جا کر ملا، وہ دارالمصنفین کی مطبوعات کے گذشتہ پچاس سال سے خریدار ہیں، اور اپنے تعلقات میں بڑی استواری

اور وضعداری کا ثبوت دیتے رہے ہیں، وہ بڑے بڑے مصنفوں کی کتابیں بھی شائع کرکے شہرت حاصل کر چکے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جو کوئی ان کو نہیں جانتا ہے اس کو وہ پڑھا لکھا آدمی نہیں سمجھتے ہیں، وہ پہلے اندرون لوہاری دروازہ کی ایک دوکان میں بیٹھا کرتے تھے، اب انار کلی کی ایک بڑی دکان میں بیٹھتے ہیں جس میں زیادہ تر انگریزی کتابیں ہیں، ان کی پرانی دوکان پر ان کے بھتیجے احمد علی صاحب بیٹھتے ہیں، یہاں میں نے تزک جہانگیری اور ڈاکٹر تاراچند کی انگریزی کتاب انفلوانس آف اسلام ان انڈین کلچر کے اردو ترجمے دیکھے، جو میری نظر سے نہیں گذرے تھے، حضرت شیخ علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب کا ایک عمدہ اڈیشن بھی دیکھنے میں آیا، اسی دوکان میں ایک صاحب نے بتایا کہ میری نئی تصنیف "ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں" لاہور کے ایک ناشر نے چھاپ لی ہے، یہ سن کر افسوس ہوا،

وہاں سے انگریزی کتابوں کے مشہور ناشر شیخ محمد اشرف صاحب سے ملنے کشمیری گیٹ گیا، ذہن میں ان کی جو تصویر تھی، اس سے مختلف نظر آئے، میں سمجھتا تھا کہ وہ صاحب قسم کے آدمی ہوں گے لیکن شیروانی اور لمبی ترکش ٹوپی پہنے ہوئے اپنے کام میں مشغول تھے، ان سے مل کر یہ اثر ہوا کہ انگریزی کتابوں کی اشاعت میں وہ ذاتی منفعت سے زیادہ خدمت کا جذبہ زیادہ رکھتے ہیں، عبد اللہ یوسف علی نے کلام پاک کا جو ترجمہ انگریزی میں کیا ہے، وہ ان کے یہاں سے شائع ہو کر بہت مقبول ہو چکا ہے، اب وہ صحیح بخاری کا بھی انگریزی ترجمہ شائع کر رہے ہیں، جس کا مسودہ مجھکو بھی دکھایا، یہ شائع ہو گیا تو ان کے ذریعہ سے ایک اور بڑا کام انجام پا جائیگا، میں نے استاذی المحترم جناب مولانا سید سلیمان ندوی کی دو کتابوں کے انگریزی ترجمے کیے ہیں، ان کو بھی انھوں نے Arab Navigation اور Heroic Deeds of Muslim Women کے نام سے شائع کیے ہیں،

دوسرے دن ادارۂ ہتول اچھرہ گیا، یہ بھی دار المصنفین کی کتابوں کا خریدار ہے، اس کے منیجر صاحب بہت ہی خلیق ہیں، ظہر کی نماز کا وقت آیا تو سامنے جماعت اسلامی کے دفتر میں جماعت ہونے والی تھی، وہاں نماز پڑھنے گیا، تو مولانا ابو الاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی نے امامت کی، نماز کے بعد ان سے تعارف ہوا، تو وہ مجھ کو اپنے دفتر لے گئے، ان کی ایک کتاب "الجہاد فی الاسلام" ان کی تصنیفی زندگی کے آغاز میں دار المصنفین سے شائع ہوئی تھی، وہ دار المصنفین کے حالات پوچھتے رہے، وہ بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن اب بھی شکیل، وجیہ اور باوقار نظر آئے، بہت سلیقہ سے رہتے ہیں، ان کے دفتر کے اندر ہر چیز میں سلیقگی اور باقاعدگی تھی، ان سے مل کر مولانا امین احسن اصلاحی کے یہاں حاضر ہوا، وہ اعظم گڈھ ہی کے رہنے والے تھے، پاکستان جانے سے پہلے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڈھ) میں مدرس تھے، ان کا دار المصنفین میں برابر آنا جانا رہتا تھا، ہم لوگوں سے بڑے اچھے تعلقات تھے، وہ مجھ سے تقریباً بیس برس کے بعد ملے، تو خوشی میں بچھے جاتے تھے، خاطر، تواضع، دعوت و مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اپنی گفتگو میں اعظم گڈھ اور یہاں کے لوگوں کے سوا کوئی اور موضوع نہیں آنے دیتے تھے جس سے اندازہ ہوا کہ ان کے دل کے اندر ان کے پرانے وطن کی یادوں کا گلدستہ ابھی تک تازہ اور شگفتہ ہے، وہ رسالہ میثاق کے اڈیٹر بھی ہیں، لیکن ان کا زیادہ تر وقت کلام پاک کی تفسیر لکھنے میں صرف ہوتا ہے، وہ مولانا حمید الدین فراہیؒ کے بڑے نامور شاگرد ہیں، فہم و تدبر قرآن میں ان ہی کے ترجمان ہیں، مولانا فراہی کی تفسیر عربی میں ہے، اور اس کا زیادہ تر حصہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا ہے، مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر اردو میں ہے، اس کا پہلا حصہ شائع ہو چکا ہے، جب ان کی پوری تفسیر چھپ کر سامنے آجائیگی تو مولانا فراہی کی تفسیروں کے ابتک نہ چھپنے کی بہت کچھ تلافی ہو جائے گی،

مجھکو واپسی کی بہت عجلت تھی، پھر بھی یہ طے کیا کہ حضرت شیخ علی ہجویریؒ کے مزار اقدس

پر حاضری دیے بغیر رخت سفر باندھنا مناسب نہیں، ایک روز اس کی زیارت کے لیے وہاں بھی حاضر ہوا میری ناچیز تصنیف بزم صوفیہ کا پہلا باب اُن ہی کے حالات سے شروع ہوتا ہے، ان کی مشہور کتاب کشف المحجوب سے بہت زیادہ متاثر ہوں، میرا خیال ہے کہ اس برصغیر میں تصوف پر اس سے بہتر کتاب ابتک نہیں لکھی گئی، یہ اسلامی تصوف کی انجیل ہے، اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہی اصلی تصوف ہے، ان کے مرقد مبارک کے پاس سڑک کے دونوں طرف پھولوں کی دکانیں تھیں، جہاں سے پھول خرید کر زائرین مزار پر چڑھاتے ہیں، میرا بھی جی چاہا کہ یہاں کے رواج کے مطابق پھول خرید کر اخراج عقیدت پیش کروں، لیکن پھر خیال آیا کہ حضرت شیخ علی ہجویریؒ شریعت کے بڑے پابند تھے، اس قسم کی قبر پرستی سے ان کی روح خوش نہ ہوگی، مزار کے نزدیک پہنچکر فاتحہ پڑھی، لیکن ایک زائر کو اس کے پاس سجدہ میں گرا ہوا دیکھکر آنکھیں بند کرلیں، کچھ حفاظ کلام پاک پڑھ رہے تھے، وہاں کھڑا تھا، تو کشف المحجوب کا سارا متن آنکھوں کے سامنے تھا، ان کا یہ قول برابر یاد آرہا تھا کہ جس شخص نے خدا کا عنایت کیا ہوا علم یعنی شریعت کو معلوم نہیں کیا اُس کا دل نادانی کے مرض میں گرفتار ہے، جس طرح آفتاب سے نور، جوہر سے عرض اور موصوف سے صفت جدا نہیں ہو سکتی ہے، اسی طرح شریعت حقیقت سے علیحدہ نہیں ہو سکتی، خیال آیا کہ اس مزار مقدس پر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے چلہ کشی کی تھی، نگاہیں ڈھونڈھ رہی تھیں کہ وہ کونسی جگہ رہی ہوگی، جہاں ہندوستان میں اسلامی تصوف کے آفتاب و ماہتاب کی روشنی پھیلانے والے یہ بزرگانِ دین متمکن ہوئے ہوں گے،

وہاں سے بادشاہی مسجد پہنچا، جس کو اورنگ زیب عالمگیر نے آج سے تقریباً تین سو سال پہلے ۱۶۷۳ء میں بنوایا تھا، ۱۹۳۲ء میں اس کو خستہ حال میں پایا تھا، جس سے دکھ ہوا تھا، لیکن اب یہ بہت بارونق نظر آئی، اس کی پوری مرمت کردی گئی ہے، معلوم ہوا کہ اس کی مرمت میں سر سکندر حیات کا بڑا حصہ ہے، انھوں نے اپنی وزارت کے زمانہ میں اس کے لیے ۲۸ لاکھ روپے جمع کیے تھے،

اس وقت سے ابتک اس سے بھی زیادہ رقمیں خرچ ہو چکی ہوں گی، اس کا ہر حصہ اب مرتب اور شاندار ہو گیا ہے، اس سے باہر اس کے چاروں طرف مرغزار اور سبزہ زار ہے، جو لاہور کے لوگوں کے لیے اچھی سیرگاہ ہے، اس کے پھاٹک کے سامنے جہانگیر کے مقبرہ کے اوپر کی بارہ دری پڑی ہے جو سکھ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس کو اجاڑ کرلے آئے تھے، مسجد کے پھاٹک کے داہنی طرف سر سکندر حیات خاں کا مزار ہے، اور اس کے بائیں جانب شاعر مشرق اقبال کا مقبرہ ہے جو افغانستان کے سابق حکمراں نادر شاہ کی طرف سے پورا سنگ مرمر کا بنایا گیا ہے، اس کے پاس پہنچا تو اپنے استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی وہ تحریر یاد آگئی جس میں انھوں نے ان کی موت پر اُن کو ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت، اسلام کا فخر، کاروانِ ملت کا حدی خواں، عارف، فلسفی، عاشقِ رسول، شاعر فلسفہ کہہ کر ماتم کیا تھا، فاتحہ پڑھتے وقت خیال آیا کہ وہ اپنی شاعری سے کیا ذہنی انقلاب پیدا کر گئے ہیں، نوجوانوں کو شاہین کا کیرکٹر دے گئے، مسلمانوں کو مردِ مومن کا پیام دے گئے، انسانیت کو خودی کے فلسفہ سے بلند کر گئے، خودی کی خلوتوں میں مصطفائی، خودی کی جلوتوں میں کبریائی کی شان پیدا کر گئے، خودی کی زد میں زمین و آسمان، کرسی و عرش سب کر گئے، انسان کی قوت بازو کے سامنے کوہ، صحرا، سمندر، گنبد افلاک، یہ ہوائیں اور یہ خاموش فضائیں سب کچھ جھکا گئے، تقدیر کا شکوہ کرنے کے بجائے تقدیر یزداں بننے کی تعلیم دے گئے، دل کی زبان کہہ رہی تھی، اے شاعرِ مشرق! تیری تربت پر رحمتِ ایزدی، برکت خداوندی اور انوار الٰہی کی بارش برابر ہوتی رہے۔ آمین

بادشاہی مسجد کے سامنے لاہور کا قلعہ تھا، اس کے اندر داخل ہوا تو اس کی پوری تاریخ سینما کے سیمیں پردوں کی طرح سامنے آنے لگی، پہلے یہ قلعہ مٹی کا تھا، مملوک سلاطین نے اس پر قبضہ کیا، منگولوں نے اس کو تباہ کیا، غیاث الدین بلبن نے اس کی از سر نو تعمیر کی، پھر تیمور نے

اس کو برباد کیا، سلطان مبارک خلجی نے اس کو پھر سے بنوایا، اکبر نے اس کی از سرِ نو تعمیر اینٹ اور پتھر سے کی، جہانگیر نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا، شاہ جہاں نے اپنے ذوق کے مطابق اس میں جا بجا سنگ مرمر کی عمارتیں بنوائیں قیمتی پتھروں کی چینہ کاری سے تمام عمارتوں میں حسن پیدا کیا، پھر سکھوں کے قبضہ میں آیا، ان کے بعد اس پر انگریزوں کا پرچم لہرایا، اور اب پاکستان کی حکومت کے زیرِ نگیں ہے، سنہ ۱۹۳۴ء میں یہاں آیا تھا، تو پورے قلعہ کو بہت ہی خستہ پایا تھا، اب کافی خرچ کر کے اس کی خستگی دور کر دی گئی ہے، اور یہ بڑی اچھی تفریح گاہ ہے، میں نے اسکی ہر چیز دیکھی، شیش محل، شاہ برج، نولکھا، دیوانِ خاص، دیوانِ عام، موتی مسجد، عرض گاہ حضوری باغ، جھروکہ، بڑی خوابگاہ، سنگ مرمر کی بارہ دری، میوزیم وغیرہ وغیرہ۔ ان کو دیکھتے وقت جذبات میں کچھ ایسا تلاطم تھا کہ کسی چیز کو بھی دیکھنے میں جی نہ لگا، خیال آیا کہ جہانگیر ایک موقع پر آیا تھا، تو اس محل کے منازلِ دلکشا اور نشیمن ہائے روح افزا کی دلکشی اور یہاں کے گل و ریاحین کی لطافت و نزاکت کو دیکھ کر پکار اٹھا تھا۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

لیکن اب یہ کھنڈر ہے، قلعہ کی باقی کچھی عمارتوں کی تعمیری شان و شوکت سے بے نیاز ہو کر ایک منہدم شدہ عمارت کے کھنڈر کے بیچ میں آکر کھڑا ہو گیا، اور اپنی زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ یہ منازلِ دلکشا اور نشیمن ہائے روح افزا کا کھنڈر نہیں بلکہ مغل فرمانرواؤں کے تدبر اور سیاست کا بھی کھنڈر ہے، انکے زمانے کی قومی حمیت اور غیرت کا بھی کھنڈر ہے، اس زمانہ کے لوگوں کی سیرت، کردار اور اخلاق کا بھی کھنڈر ہے، وہ اپنے حکمرانوں کے قلعے کے ساتھ اپنے اخلاق و کردار کا بھی قلعہ بناتے رہتے تو دامن دل ۔۔۔۔ کو جو چیزیں کھینچتی تھیں، وہ کھنڈر نہ ہونے پاتیں، ان کا کردار کھنڈر بن گیا تھا، اسلئے ان کے حکمرانوں کا قلعہ بھی کھنڈر بن گیا، اس قلعہ کی شکستہ دیواریں کہہ رہی ہیں کہ قوم جنگی قلعہ

اور اس کے دلکشا منازل اور روح افزا نشیمنوں سے نہیں بنتی، ہاں اسکے کردار کے شاہ برج، اسکی سیرت کے دیوانِ خاص اور اسکی غیرت کے نولکھے بنائے جاتے ہیں تو پھر اسکی مملکت کے اندر اسکی ہر چیز میں پچین کاری استرکاری اور ترصیع کاری نظر آتی ہے، اور اسکی کوئی چیز نہیں بگڑتی لیکن اگر اسکے سیرت و کردار کھنڈر ہیں تو ظاہری نمود و نمایش اور استحکام کے باوجود اس کی ہر چیز کھنڈر ہے، اس لحاظ سے لاہور کا قلعہ ایک تفریح گاہ نہیں، بلکہ عبرت کدہ نظر آیا، اس کی شکستہ عمارتیں یہ پیام دے رہی ہیں کہ جہاں یہ واقع ہے، وہاں کے لوگوں کو اپنے عروج و کمال کی تاریخ کے ساتھ اپنے گذشتہ زوال کے اسباب پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

اسی روز پاکستان کے مشہور اخبار نویس جناب مجید نظامی سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی وہ پہلے نوائے وقت کے اڈیٹر تھے، اب اس سے علحدہ ہو کر ندائے ملت نکالتے ہیں، وہ دار المصنفین کے بڑے قدردان ہیں، انھوں نے دار المصنفین کی مطبوعات کے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنے اخبار کے ذریعہ فضا پیدا کرنے کا یقین دلایا، ان کی متانت اور سنجیدگی سے متاثر ہوا،

لاہور سے روانہ ہوتے وقت بڑا قلق رہا کہ وقت کی قلت کی وجہ سے مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر عنایت اللہ، ڈاکٹر سید عبد اللہ اور شورش کشمیری صاحب سے نہ مل سکا۔

جناب شیخ محمد اکرام صاحب نے اپنی تصنیف رود کوثر کا جو تازہ ترین اڈیشن میری قیام گاہ پر بھیجا، وہ لاہور سے ہندوستان تک بہت اچھا زادِ سفر رہا، لاہور چھوڑتے وقت گل برگ اور شاہراہ اقبال سے گذرا، جو اس شہر کے بہترین حصے ہیں، گینڈا سنگھ اور حسینی والا دونوں کے چیک پوسٹ پر مسافروں کے لیے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں بنی ہوئی ہے، وہ اپنے بستروں اور ٹرنکوں پر بیٹھ کر وقت گذارتے ہیں، میں بھی اپنے ہولڈال پر بیٹھا رود کوثر پڑھتا رہا، جس سے یہ صبر آزما وقت اچھا گذرا، حسینی والا میں ایک مہربان اور بامروت ہندو رکشہ والے نے میری بہت سی مشکلیں حل کر دیں،

اور بہت ہی اخلاق سے فیروز پور چھاؤنی کے اسٹیشن تک پہنچایا، درمیانی راستے کے مناظر بہت اچھے تھے، روود کوثر پڑھتا جاتا اور یہ مناظر بھی دیکھتا جاتا، مے دو آتشہ کا لطف حاصل ہو رہا تھا، اس کتاب کے پہلے اڈیشن کو بھی پڑھا تھا، لیکن اس نئے اڈیشن میں بہت کچھ اضافہ ہے، لائق مصنف کے قلم میں بڑا زور ہے، وہ لکھتے وقت اپنے ناظرین کو محسوس کراتے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ حرف آخر ہے، اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں، یہ ان کے طرز ادا کی خوبی ہے، کتاب کے اندرونی ٹائٹل پر لکھا ہوا ہے کہ یہ مغلیہ دور کی مذہبی، فکری اور علمی تاریخ ہے، لیکن یہ کتاب تاریخ نہیں بن سکی ہے، کیونکہ تاریخی واقعات کی ترتیب اور تنظیم میں جو تسلسل ہونا چاہیے وہ اس میں نہیں، اگر اس میں سے کوئی حصہ نکال دیا جائے تو اس کے ناظرین کو اس میں کوئی کمی محسوس نہ ہوگی، عہد مغلیہ میں جو بعض مذہبی اور فکری تحریکیں پیدا ہوئیں اور اس دور میں جو بعض مشاہیر علما، اور مشائخ گذرے، ان سے متعلق مصنف کے تاثرات کا یہ بہترین مجموعہ ہے جس سے اس دور کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اس کا جب پہلا اڈیشن شائع ہوا تھا تو اس قسم کی معلومات لوگوں کی نظروں سے کم گذری تھیں، اس لیے یہ پسند کی گئی اور خوب پڑھی گئی، اب اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور لکھا جا رہا ہے، اس لیے اس کے مطالعہ کی نوعیت کچھ بدل گئی ہے، پھر بھی یہ کتاب اردو کی بہت اچھی تصانیف میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، خود مجھ کو بھی مجموعی حیثیت سے یہ بہت پسند آئی، کہیں کہیں لائق مصنف کے خیالات، تحقیقات اور استنباطات سے اختلاف ضرور ہے، لیکن ان کا اظہار چنداں ضروری نہیں، خصوصاً ان سے خوشگوار ملاقات کے بعد۔

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

میرے اس سفرنامہ کی یہ آخری قسط مطبع میں جا چکی تھی کہ اچانک جناب شیخ محمد اکرام صاحب کا ایک تار نیپال کے دار السلطنت کٹھمنڈو سے ملا کہ وہ ۱۰ مئی کی شام کو اعظم گڈھ پہنچ رہے ہیں، وہ وہاں کسی

سمینار میں گئے ہوئے تھے، نیپال سے اعظم گڈھ آنا اور ہفت خواں طے کرنا دونوں برابر ہے، یہاں مئی کا مہینہ بڑا سخت ہوتا ہے، لیکن اس سخت موسم میں ان کی ٹیکسی دار المصنفین میں داخل ہوئی تو ایسا معلوم ہوا کہ ان کی تحریروں سے جو گلے اور شکوے کبھی پیدا ہوئے تھے، وہ سب جاتے رہے، ہم لوگ نیازمند ہو کر ان کے خیر مقدم کے لیے جھکے ہوئے تھے، انھوں نے اس نیازمندی کو دیکھ کر فرمایا کہ ان کے پاکستان کے بعض دوست کہا کرتے تھے کہ وہ اعظم گڈھ گئے تو ان کی سخت مخالفت ہوگی، مگر وہ یہاں بڑی محبت اور یگانگت پا رہے ہیں، ان سے ہر قسم کی باتیں دل کھول کر بڑی بے تکلفی سے ہوئیں، زیادہ تر مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور حیات شبلی موضوع رہا، وہ حیات شبلی کے اسی حصہ پر زیادہ باتیں کرتے رہے جس میں مولانا شبلی اور سرسید کے اختلاف کا ذکر ہے، انھوں نے جو کچھ کہا، ہم لوگوں نے نہایت خندہ پیشانی سے سنا، لیکن ہمارے خیالات وہی رہے جس کا اظہار اس مضمون کے شروع میں ہم کر چکے ہیں، انھوں نے دار المصنفین کے احاطہ کو بہت ہی پر فضا پایا، مولانا شبلی کو ایک Creative Genius کہا، ان کی قبر پر پھول بھی چڑھائے، وہ گلہ مند ہوئے کہ ان کی قبر بہت سادہ اور کتبہ کے بغیر ہے، میں نے ان سے ہنس کر کہا کہ دار المصنفین تو خود ان کی قبر کا کتبہ ہے، مگر وہ اس سے مطمئن نہ تھے، وہ اس کو ایک خوبصورت مقبرہ کی شکل میں پھولوں سے لدا ہوا دیکھنا چاہتے تھے، وہ کل یہاں ۲۴ گھنٹے رہے، اور کچھ ایسے گھل مل گئے کہ ہم لوگوں کا جی چاہتا تھا کہ وہ یہاں دو تین روز اور قیام کریں، لیکن ان کا پروگرام کچھ ایسا تھا کہ وہ زیادہ قیام نہ کر سکے، جب ہم لوگوں نے ان کو رخصت کیا تو ایسا محسوس ہوا کہ علم کے ایک شیدائی، ادب کے ایک فدائی، فن کے ایک بڑے قدر دان اور ضرورت کے وقت بہت اچھے دوست کے ساتھ دار المصنفین کے اندر بڑے ہی خوشگوار لمحات گذرے۔

شوقی اور ان کی شاعری

۱۸۶۹ء - ۱۹۳۲ء

از جناب مولوی مقتدیٰ حسن صاحب اعظمی فاضل الازہر یونیورسٹی قاہرہ

(۴)

مذہبی اشعار مذہبی شاعری میں شاعر کے دینی رجحان، خالق کائنات سے تعلق اور مذہب کی مقدس چیزوں کے بارے میں شاعر کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ معاشرہ اور سماج کے حالات کی تصویریں بھی ہوتی ہیں، کیونکہ شاعر اپنے گرد و پیش سے بھی متاثر ہوتا ہے اور اس تاثر کو بھی الفاظ کا جامہ پہناتا ہے، اگر کوئی معاشرہ زبوں حالی کا شکار ہو جائے تو اس دور کے شعراء کے کلام میں حزن و ملال اور دنیا کی بے ثباتی کے اشعار ملیں گے، اسی طرح جنگ یا سماجی ترقی کے دور کی شاعری میں جوش و ولولے کی جھلک نظر آئے گی، اول الذکر کی مثال میں ابن الفارض (متوفی ۶۳۲ھ) کو اور آخر الذکر کی مثال میں ابو تمام (متوفی ۲۳۱ھ) کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

شوقی بھی اپنے مذہبی کلام میں ماحول سے متاثر ہوئے اور وقت کے تقاضوں کے ساتھ چلنے کی کوشش کی، ان کے دور میں "اسلامی اتحاد" کا نعرہ بلند ہو چکا تھا جس کا مقصد اسلامی ممالک کو متحد کر کے ان کو تقویت پہنچانا تھا، ترکی خلیفہ سلطان عبد الحمید نے اس اتحاد کی دعوت دی تھی، اور سید جمال الدین افغانی اس تحریک کے روح رواں تھے، شوقی نے بھی اپنے اشعار سے اس تحریک کی تائید و حمایت کی اور آخیر تک اس کی تاثیر و افادیت پر انھیں یقین رہا۔

شوقی پکے مسلمان تھے اور ان کو اپنے اسلام پر فخر تھا، اس لیے ان کی شاعری کا بڑا حصہ اسلامیات

سے متعلق ہے، لیکن ان کے دیوان کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ وہ زاہد خشک نہ تھے بلکہ جام و مینا سے بھی شغل رکھتے تھے، یہ ان کی زندگی کا عجیب تضاد ہے، جس کو ان کی مذہبی شاعری پر بحث کرنے سے پہلے دور کرنا ضروری ہے، آئندہ سطور میں اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی جائے گی۔

شوقی کے دیوان میں ایک حصہ ایسا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیوی عیش و تنعم میں ڈوبی ہوئی زندگی بسر کرتے تھے، اور "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے فلسفہ پر یقین رکھتے تھے، لیکن دوسری طرف ایسے اشعار بھی بکثرت ہیں، جن میں شاعر کا دینی جذبہ دوسرے تمام جذبات پر غالب ہے، اور اس نے آخرت کے لیے اپنی دنیا کو تج دیا ہے۔ ذیل میں دونوں طرح کے اشعار پیش کیے جاتے ہیں، پھر اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

خمریات شوقی کو خمریات سے غیر معمولی دلچسپی تھی، ان کی خمریات کو دیکھ کر ابو نواس کے اشعار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے[1]، ایک جگہ مے نوشی کا یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اس سے منافقانہ ماحول سے نکل کر انسان آزاد فضا میں پہنچ جاتا ہے

فلعل سلطان المدامة مخرجي　　　من عالم لم يحو غير نفاق

(شاید شراب مجھے ایسی دنیا سے بچا لے جس میں نفاق کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے)

ایک جگہ کہتے ہیں کہ شراب سے انسان کے نفس کو آرام ملتا ہے اور غم غلط ہو جاتا ہے:

راحة النفوس وهل　　　عند راحة تعب؟

(شراب باعث راحت و تسکین ہے، اس سے کسی طرح کا رنج نہیں ہو سکتا)

لا تسقني الا دهاقا انني　　　أسقى بكأس في الهموم دهاق

(شراب کے لبریز پیمانے پلاؤ کیونکہ غم میں لبریز پیمانے ہی پیتا ہوں)

---

[1] ڈاکٹر ماہر حسن فہمی: شوقی: شعرہ الاسلامی ص [illegible]

غزل کے اشعار کا نمونہ یہ ہے:

مشت علی الحسن یہانی ملقیتھا   للناظرین وبانا فی تثنیہا

(محبوبہ چلتے ہوئے غزال کی طرح مڑتی اور شاخ کے مانند لچکتی تھی)

وفتاۃ ما زادھانی غریب الـ...... حسن الاعواتب الاخلاق

(دوشیزہ کے حسن کو اس کے اچھے اخلاق نے دوبالا کر دیا ہے)

ذقت منہا حلواً ومراً وکانت   لذۃ العشق فی اختلاف المذاق

(محبوبہ کی جانب سے تلخ وشیریں دونوں سے سابقہ رہا ہے اور عشق کا مزہ اسی اختلاف میں ہے)

شوقی نے جن اشعار میں دور شباب کے کوائف اور واقعات کا تذکرہ کیا ہے ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں جوانی کے ختم ہو جانے کا اگر کچھ رنج وغم ہے تو صرف اس لیے کہ اس زندگی کے ساتھ ہی ساتھ محبت اور اس کی گوناگوں دلچسپیاں بھی ختم ہو گئیں،

بعض ناقدین نے لکھا ہے کہ شوقی کے غزلیہ اشعار مصنوعی اور غیر واقعی ہیں، انھوں نے محبوبہ سے ملاقات وغیرہ کی داستانیں محض خیالی لکھی ہیں، (فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۲۳۶) لیکن یہ خیال صحیح نہیں، شوقی کی غزل نہ تو خیالی ہے اور نہ قدیم شاعری کی نقل وتقلید، بلکہ انھوں نے غزلیہ اشعار میں اپنی زندگی اور تجربات کی ترجمانی کی ہے، جس ماحول میں شوقی تھے، اسی ماحول کو اپنے اشعار میں پیش کیا ہے،

شوقی کا تغزل دو طرح کا ہے، تقلیدی جو قدیم طرز کے مطابق قصیدوں کی تشبیب میں ہوتا ہے، اس میں تکلف وتصنع اور جذبات کا فقدان نمایاں ہے، کیونکہ اس تغزل میں صرف قدیم شعراء کی تقلید ہوتی ہے، اپنے جذبات کی ترجمانی نہیں،

دوسرے وہ قصائد جو تمامتر تغزل پر مشتمل ہیں، ان میں شاعر نے اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے،

اس قسم کے اشعار میں جذبات کی سچی تصویریں ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شوقی کے غزلیہ اشعار ان کی محبت اور ان کے عاشقانہ جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے کسی مخصوص محبوبہ کو متعین نہیں کیا،[1]

یہ شوقی کے ان اشعار کا جن سے ان کی آزاد طبیعت اور غیر دینی رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے مختصر جائزہ تھا، اب تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا جاتا ہے۔

تدین اور زہد شوقی کے دینی اور زاہدانہ اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے زاہد وعالم دین ہیں، لہو ولعب اور عیش وعشرت سے انھیں شدید نفرت ہے،

ربنا یا ذا التجلی والجلال   یا خفی اللطف یا رب النوال

(اے رب ذو الجلال   اے لطیف وصاحبِ عطا

ھب لنا الصالح من عمر ومال   ربنا والطف بنا فی کل حال

(ہمیں پاکیزہ زندگی اور مال عطا کر   اور ہر حال میں ہم پر رحم فرما)

ربنا ثبت علی الحق القلوب   وامنع الاسواء عنا والخطوب

(دلوں کو حق پر ثابت رکھ   اور مصائب ومحن کو ہم سے دور رکھ)

ربنا اللھم جنبنا الذنوب   واھدنا الحکمۃ فی کل الفعال

(ہمیں گناہوں سے بچا   اور ہر کام میں صحیح سمجھ عطا فرما)

ربنا اللھم اصلح شأننا   واقم فی نفعنا حکامنا

ہمارے حالات کو سدھار دے   اور حکام کو ہمارے لیے نفع بخش بنا دے

ربنا واحفظ بنا اوطاننا   واجعل الملۃ فی اوج الکمال

ہمارے ذریعہ ہمارے وطن کی حفاظت کر   اور مذہب کو معراج کمال تک پہنچا دے)[2]

[1] شوقی: شعراء الاسلامی ص ۱۰۱، [2] الشوقیات ص ۱۰، طبع ۱۹۱۱ء

ایک مقام پر کہتے ہیں :-

الٰھی قد اتیتک قبل نومی مقراً بالاساءۃ طول یومی

الٰھی ان ظلمت وان کذبت وان یوماً بلا سبب غضبت

فانی یا غفور الیک تبت وانک اکرم المتجاوزینا[1]

(خدایا سونے سے پہلے دن بھر کے گناہوں پر ندامت کا جذبہ لے کر حاضر ہوا ہوں

خدایا اگر میں نے ظلم، جھوٹ یا بلا وجہ غصہ سے اپنا دامن آلودہ کیا ہو

تو اب تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں اور تو سب سے بڑھ کر معاف کرنے والا ہے۔)

ان اشعار سے شاعر کے دینی جذبات، خدا سے اسکے تعلق، خشوع و تضرع اور ندامت و امید کی ملی جلی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے، 'الٰہی' اور 'ربنا' کی تکرار خدا سے اس کے غیر معمولی لگاؤ کی پوری دار آئینہ

ترکی حکومت کو جب یونانیوں پر فتح حاصل ہوئی تو شوقی کو بڑی خوشی حاصل ہوئی، اور اس کامیابی کو انھوں نے دین اسلام کی کامیابی اور فتح سے تعبیر کیا۔

بسیفک یعلو الحق والحق اغلب وینصر دین اللہ ایان تضرب

(تمھاری تلوار سے حق کو بلندی حاصل ہوتی ہے اور وہ غالب آتا ہے، تمھاری ہر ضرب دین کی نصرت و فتح ہو)

شوقی کے دینی اشعار سے ابو العتاہیہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ موت سے زندگی کی مسرتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور دوستی اور دشمنی کے تمام رشتے ٹوٹ جاتے ہیں، موت و زیست کے اس سلسلہ میں یہ راز مضمر ہے کہ انسان کی زندگی کا ایک مقصد ہے اور وہ ایک مخصوص غرض و غایت کے لیے مرتے یا جیتے ہیں، اس زندگی کے بعد انسان کو آخرت کی زندگی میں حساب و کتاب کا سامنا کرنا ہوگا۔ اور پہلی زندگی کے اعمال کا بدلہ لے گا، اور یہ دنیوی زندگی اخروی زندگی کا نمونہ ہے۔ اس لیے انسان کو دنیا میں آخرت کے لیے توشہ سیرت طیبہ، عمل صالح، نیک روش

---

[1] الشوقیات ص ۱۱ طبع ۱۹۱۱ء

اور پاکدامنی سے آراستہ ہونا ضروری ہے،

وجدت الحیاۃ طریق الزمر الی بعثۃ وشئون أخر

وما باطلاً ینزل النازلون ولا عبثاً یزمعون السفر

فلا تحتقر عالماً انت فیہ ولا تجحد الآخر المنتظر

وخذ لک زادین من سیرۃ ومن عمل صالح یدخر

وکن فی الطریق عفیف الخطی شریف السماع کریم النظر

(لوگ زندگی کی راہ سے بعثت اور دوسرے امور کی طرف جا رہے ہیں

آنے والے بلا وجہ نہیں آتے، اور نہ تو ان کا سفر عبث ہوتا ہے

موجودہ دنیا کو حقیر نہ سمجھو اور نہ تو آخرت کا انکار کرو

اپنے لیے بہتر سیرت اور نیک عمل کو توشہ بنا لو۔

اپنی روش میں عفت و پاکدامنی اور شرافت و بزرگی کا لحاظ رکھو)

شوقی کے زہد کا کمال ملاحظہ فرمائیے، موت کو غمہائے روزگار سے نجات کا ذریعہ قرار دیتے ہیں :

یا موت مل بالشراع واحمل جریح الحیاۃ

سر بالقلوع السراع الی شطوط النجاۃ

(اے موت! رنجور حیات کو اپنے سفینہ میں اٹھا لے چل

اور اس سفینہ کو تیزی سے نجات کے ساحل پر پہنچا دے)

کبھی عیش و ہوا پرستی میں غلو بھی انسان میں گناہ کا احساس پیدا کر دیتا ہے اور وہ ذہنی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس سے نکلنے کے لیے وہ اللہ سے لو لگاتا ہے اور اسکی غفاری و ستاری کا سہارا لیتا ہے۔

دعوتك والضمير يطيل لومی — وانت الله خیرا الراحمينا

ان جل ذنبي عن الغفران لی امل — فی الله يجعلنی فی خیر معتصم

(میں تجھے پکارتا ہوں اور ضمیر مجھے برابر ملامت کرتا ہے، اور اے اللہ تو سب سے بہتر رحیم ہے
گناہوں کی سنگینی کے باوجود مجھے اللہ کی ذات سے نجات کی امید ہے)

اور کبھی یہ سوچتا ہے کہ اس کے لیے نجات کا دروازہ بند ہے، کیونکہ اس کے گناہ بہت بڑے اور بے شمار ہیں:

ویارب هل تغنی عن العبد حجة — وفی العمر مافیه من الهفوات

(زندگی کی بے شمار لغزشوں کے بعد بندہ کو کوئی حجت کام نہیں دے سکتی)

شوقی کے ان اشعار سے ان کے دینی جذبات، خدا سے تعلق و تضرع اور زاہدانہ افکار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ درحقیقت شوقی کے کلام کا یہ تضاد اور ان کی طبیعت کے یہ دو مختلف رجحانات سماجی تبدیلیوں کا نتیجہ ہیں، جن میں افراد کی نفسیات کا عام رخ یہی ہوتا ہے، انیسویں صدی میں اسلامی ممالک خصوصاً مصر میں بڑی اجتماعی، ثقافتی اور سیاسی تبدیلیاں ہوئیں، اس زمانہ میں تمام اسلامی ممالک مغربی تہذیب کی طرف قدم بڑھا رہے تھے، جس کی نمایاں خصوصیت دنیا اور اس کی لذتوں کی طلب ہے، مگر ماضی سے بھی ان کا تعلق قائم تھا، اس لیے اس دور کی زندگی قدیم اسلامی تہذیب اور جدید یورپین تہذیب کا مجموعہ بن گئی تھی اور اس نئی تہذیب کے ساتھ ہی وہ تمام افکار و خیالات اسلامی دنیا میں داخل ہوچکے تھے، جن کو مغربی تہذیب کی خصوصیت قرار دیا جاسکتا ہے، شوقی کا بھی دونوں تہذیبوں سے سابقہ پڑا، اس لیے دونوں سے ان کا متاثر ہونا ضروری تھا،[1]

۱؎ ماہر حسن فہمی: شوقی: شعرہ الاسلامی ص ۹۷

اس دور کا پورا معاشرہ اس طرح کے تضاد کا شکار تھا، معاشرہ کے اسی تضاد نے لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کا تذبذب پیدا کر دیا تھا، وہ کبھی قدیم کو ترجیح دیتے تھے اور کبھی جدید کو، کبھی دین کی طرف لپکتے تھے اور کبھی اس سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے، گویا قدیم و جدید افکار و رجحانات کے درمیان ایک زبردست قسم کی کشمکش برپا تھی، شعراء رقت شعور کی وجہ سے اس کشمکش سے زیادہ متاثر ہوئے، اس لیے شوقی نے بھی اسی زمانہ میں بہت سی موروثی عادات و رسوم کو ترک اور نئی عادتوں کو قبول کیا، ڈاکٹر ہیکل لکھتے ہیں: شوقی کبھی مذہبی آدمی ہیں اور کبھی مذہب سے آزاد، اور ان دو متضاد پہلوؤں میں وہ سچے ہیں، کیونکہ اس دور کے حالات نے شاعر کو اس متضاد مرحلہ تک پہنچا دیا تھا،[1]

شوقی ایک مومن اور مسلمان تھے، لیکن سماجی تبدیلیوں کے دور میں انھوں نے زندگی بسر کی جس میں ان کے سامنے لذت پرستی پر آمادہ کرنے والی چیزیں آئیں، اور وہ اپنی رقیق طبیعت کی وجہ سے ان کی طرف کبھی کبھی مائل بھی ہوگئے، علی نجدی کا بیان ہے: دوسرے لوگوں کی طرح شوقی کے سامنے بھی لذت و عیش پرستی اور زہد و دینداری کے محرکات آئے اور وہ دونوں ہی سے متاثر ہوئے جیسا کہ عام شعراء کا طریقہ ہے۔[2]

مذہبی شاعری کے اہم عنوانات

شوقی ایک سچے مذہب پرست اور دینی آدمی تھے، اسلام سے انھیں محبت اور دلی لگاؤ تھا، لیکن ماحول اور معاشرے کے اثرات سے ان کی زندگی میں کچھ ایسے عناصر شامل ہوگئے تھے جنھوں نے انھیں لذت پرستی کی طرف مائل کیا، اس کے باوجود ان کے دیوان کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا بڑا حصہ اسلامی موضوعات و شخصیات سے متعلق ہے جو شاعر کی مذہب پرستی اور اسلام دوستی کا ثبوت ہے، ڈاکٹر زکی المحاسنی لکھتے ہیں: شوقی کے

۱؎ مقدمۃ الشوقیات ج ۱ ص ۱ ۲؎ علی النجدی: الدین والاخلاق فی شعر شوقی ص ۱۴۱

دیوان "الشوقیات" کی چاروں جلدوں یا "الشوقیات المجہولہ" میں جتنے قصائد ہیں ان میں خدا، رسول دین و مذہب، اخلاق اور تقویٰ کا ذکر ہے اور جدید ادبی تاریخ میں اگر کسی کو اسلام کے "شاعر اعظم" کا لقب دیا جا سکتا ہے تو وہ شوقی ہیں۔[۱]

شوقی نے اسلام کے دینی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ مسلم لیڈروں پر بھی توجہ دی، اس پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے،

مسلم قائدین "مسلم قائدین اور اسلامی اتحاد" دونوں اس زمانہ میں لازم و ملزوم تھے، مسلم لیڈروں کی تنظیم و احترام اور ان کی جد و جہد کے تذکرہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ان کی تقلید کی دعوت دی جائے، جس کے ذریعے آج کا مسلمان بھی اسی بلند و بالا مقام کو حاصل کر سکے جس پر اس کے اسلاف متمکن تھے، شوقی نے اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں البوصیری کے قصیدہ البردہ کے تقلید میں اپنا مشہور قصیدہ "نہج البردہ" کہا جس کا مطلع یہ ہے:

ریم علی القاع بین البان والعلم — احل سفک دمی فی الاشہر الحرم

نعت نبی میں دوسرا قصیدہ "ذکری المولد" ہے جس کا مطلع ہے:

سلوا قلبی غداۃ سلا وتابا — لعل علی الجمال لہ عتابا

حضور کی مدح میں ان کا ہمزیہ قصیدہ عرب دنیا میں آج بھی مشہور اور زبان زد عوام و خواص ہے، اس کا مطلع ہے:

ولد الھدی فالکائنات ضیاء — وفم الزمان تبسم وثناء

(ہدایت پیدا ہوئی ساری کائنات اس کی روشنی سے منور ہو گئی اور زمانہ کے لب تبسم اور ثنا میں ڈوب گئے)

ان کے قصیدے "دول العرب وعظماء الاسلام" میں اسلامی تاریخ کے بیشتر اہم واقعات نظم کئے گئے ہیں،

---

[۱] دعوۃ الحق ص ۵، نومبر ۱۹۶۸ء

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کی مدح میں جن شعراء نے نعتیہ قصیدے لکھے، ان میں سے اعشیٰ اور کعب بن زہیر وغیرہ قابل ذکر ہیں، آپ کے وصال کے بعد شعراء نے سیاسی مصالح کی بنا پر اہل بیت اور حضور کی تعریف میں اشعار لکھے، بعض نے ادبی ذوق اور شاعرانہ رجحان کی بنا پر اس وادی میں قدم رکھا، لیکن البوصیری اور شوقی کا شمار ان شعراء میں ہے جنھوں نے سچے جذبہ سے اس موضوع پر قلم اٹھایا، ان کے دل کی تڑپ نے انھیں حضور اکرم کی مدح و توصیف پر مجبور کر دیا، شوقی نے اپنے نعتیہ قصائد میں حضور کی ان صفات کو خصوصیت سے نمایاں کیا ہے جن سے دعوت اسلام کے پھیلنے میں مدد ملی، اور دشمنوں نے آپ کے حسن اخلاق سے متاثر ہو کر آپ کی صداقت کا کلمہ پڑھا، اس سے شوقی کا مقصد یہ تھا کہ اگر آج بھی مسلمان ان صفات عالیہ و اخلاق حسنہ کو اپنے اندر پیدا کر لیں تو اس سے اسلام کو تقویت حاصل ہوگی،

ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں:-

واذا سخوت بلغت بالجود المدیٰ — وفعلت مالا تفعل الانواء

واذا غضبت فانما ھی غضبۃ — فی الحق لاضغن ولا بغضاء

واذا خطبت فللمنابر ھزۃ — تعرو الندی وللقلوب بکاء

واذا قضیت فلا ارتیاب کانما — جاء الخصوم من السماء قضاء

واذا ابتنیت فخیر زوج عشرۃ — واذا ابتنیت فدونک الآباء

واذا صحبت رای الوفاء مجسما — فی بردک الاصحاب والخلطاء

(آپ سخاوت کرتے ہیں تو انتہا کو پہنچ جاتے ہیں، بادل بھی آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے

آپ کا غصہ حق کے لیے ہوتا ہے، اس میں کینہ اور دشمنی نہیں ہوتی

آپ جب خطبہ دیتے ہیں تو منبر اور مجلس جھوم اٹھتی ہے اور دل رونے لگتے ہیں

آپ فیصلہ شک و شبہ سے پاک اور آسمانی فیصلہ ہوتا ہے

آپ ایک مثالی شوہر اور ایک مثالی باپ ہیں

آپ صحابہ اور ملنے والوں کے لیے سراپا وفاداری ہیں)

شوقی نے اپنے نعتیہ قصیدہ میں ان اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے جو اسلام پر کیے جاتے ہیں، اُن ہی میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام نے اپنی دعوت کو پھیلانے کے لیے تلوار سے کام لیا، حالانکہ انبیاء کا مقصد خونریزی نہیں ہوتا، وہ تو عالم کے لیے رحمت ہوتے ہیں، شوقی نے اس الزام کی پوری تردید کی اور دکھایا کہ اسلام پر اعتراض کرنے والے ذرا ایک نظر مسیحی مذہب پر ڈال لیں، جس کے متبعین کی خونریزیوں سے آج بھی تاریخ کے صفحات رنگین ہیں، لکھتے ہیں :-

قالوا غزوت ورسل اللہ ما بعثوا	بقتل نفس ولاجاؤا السفک دم
جهل وتضليل احلام سفسطه	فتحت بالسيف بعد الفتح بالقلم
والشر ان تلقه بالخير ضقت به	ذرعاوان تلقه بالشر ينحسم
سل المسيحية الغراء کم شربت	بالصاب من شهوات الظالم الغلم
لولاحماة لها هبوا لنصرتها	بالسيف ما انتفعت بالرفق والرحم

لوگوں کا اعتراض ہے کہ آپ نے جنگ کی حالانکہ رسول کا منصب قتل و خونریزی نہیں ہوتا لیکن یہ نادانی، خام خیالی اور بکواس ہے، آپ نے تلوار سے پہلے قلم کے ذریعہ قلوب کو فتح کیا ہے اگر انسان برائی کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے دینے لگے تو پریشانی میں مبتلا ہو جائیگا، اور اگر برائی کا بدلہ برائی سے دے تو برائی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مسیحی مذہب سے پوچھو کہ کتنی خون آشامیوں کے بعد اس کی اشاعت ہوئی ہے؟

اگر مسیحیت کے مددگار تلوار لیکر نہ اٹھتے تو نرمی سے اس کو کوئی فائدہ نہ ملتا۔)[1]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ شوقی نے ان مشاہیر اسلام کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کے کارنامے آج بھی زندہ ہیں، اور جن پر ہمیشہ اسلامی تاریخ فخر کرے گی، چنانچہ "نہج البردہ" میں خلفائے راشدین کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ اور "دول العرب وعظماء الاسلام" میں اہم اسلامی شخصیتوں اور حکومتوں کا ذکر ایسے دلنشین انداز میں کیا ہے جس سے اسلاف اور ان کے کارناموں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ذکر میں ان کی فتوحات، نشر و اشاعت اسلام میں انکی جد و جہد دینی غیرت، زہد و تقویٰ اور جود و سخا، ان تمام اوصاف کا تذکرہ کیا ہے:

فيا اخا الضراء والشدائد	والناس اخوان لدى الفوائد
وقدوة الزهاد بعد الهادى	وصاحب الهجرة والجهاد
ويارحيما قلبه رقيقا	بماله كم حرر الرقيقا

(اے سختیوں میں لوگوں کے کام آنے والے، لوگ تو صرف آرام کے وقت دوست بنتے ہیں

حضور کے بعد آپ زاہدوں کے پیشوا اور صاحب ہجرت و جہاد ہیں

رحیم اور رقیق القلب ہیں، اپنے مال سے بیشمار غلاموں کو آزاد کرا چکے ہیں)

اسی طرح حضرت عمر بن الخطاب، عثمان بن عفان اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم سب کا تذکرہ نہایت والہانہ انداز سے کیا ہے، اور ان کے ان کارناموں کو گنایا ہے،

اس کے بعد حضرت خالد بن ولید، حضرت معاویہ اور عبدالرحمٰن الداخل وغیرہ مشاہیر کا ذکر کیا ہے، اور عباسی اور فاطمی حکومتوں پر یہ قصیدہ ختم کیا ہے، عباسی حکومت کی مشہور شخصیت ابو جعفر المنصور اور فاطمی حکومت کی مشہور شخصیت المعز لدین اللہ کی تعریف کی ہے، اور ان کے

[1] الشوقیات ج ۱ ص ۲۴۲

تعمیری کاموں کو سراہا ہے۔ ایک دوسرے قصیدے میں جس کا عنوان ہے "کبار الحوادث فی وادی النیل"، صلاح الدین ایوبی کی مدح میں ان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے،

مزقت جمعهم علی کل ارض — مثلما مزق الظلام الضیاء

هکذا المسلمون والعرب لحنا — لون لا ما یقوله الاعداء

(ہر جگہ ان کے شیرازہ کو تو نے منتشر کر دیا جیسے روشنی سے تاریکی چھٹ جاتی ہے، مسلمان عرب ایسے ہی ہوتے ہیں نہ کہ جیسا دشمن سمجھتے ہیں)

اسلاف کے تذکرے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے مسلم قائدین اور مشہور لیڈروں اور بادشاہوں کا بھی ذکر کیا ہے، ان میں ترکی خلیفہ کا نام سب سے نمایاں ہے، عرب لیڈروں کے علاوہ دوسرے ممالک کے مسلم لیڈروں کی خدمات کو بھی سراہا ہے، اور ان کی وفات پر آنسو بہائے ہیں، ہندوستان کی مایۂ ناز شخصیت مولانا محمد علی جوہر کی وفات اور بیت المقدس میں تدفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

یاقدس هیئ من ریاضك ربوة — لنزیل تربك واحتفل بلقائه

بطل حقوق الشرق من احماله — وقضیة الاسلام من اعبائه

لم تنس الهند العزیزة رقة — للشرق او سهرا علی اشیائه

ثم فی جوار الله ما بك غربة — فی ظل بیت انت من ابنائه

(اے سرزمین بیت المقدس اپنے چمن کا ایک گوشہ اس مہمان کے لیے بھی خالی کر دے اور اسکے ساتھ تپاک سے پیش آ۔

اس مرد جانباز نے مشرق کے حقوق اور اسلام کے معاملہ میں مدافعت کا بیڑا اٹھایا تھا،

ہندوستان کے مسائل میں مشرق اور اسکے معاملات کو اس نے کبھی فراموش نہیں کیا

اللہ کے جوار میں آرام سے سو جا جس گھر کا تو فرزند ہے اسکے سایہ میں تجھے مسافرت کا احساس نہیں ہونا چاہیے)

اسی طرح شوقی نے متعدد سیاسی و دینی زعماء و اکابر کا تذکرہ کیا ہے، اور مسلمانوں کو انکے نقش قدم پر چلنے کی دعوت دی ہے۔

اخلاقیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی انسانی اخلاق کی اصلاح تھی "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" اس کے بغیر اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا، اس لیے شوقی نے اخلاقیات پر غیر معمولی توجہ دی ہے، اخلاق کا مقام ان کے نزدیک بہت اہم ہے، جو قوم عمدہ اخلاق کھو دیتی ہے اس کا کوئی وزن باقی نہیں رہتا، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وانما الامم الاخلاق ما بقیت — فان هموذهبت اخلاقهم ذهبوا

کذا الناس بالاخلاق یبقی صلاحهم — ویذهب عنهم امرهم حین تذهب

ولقد یقام من السیوف ولیس من — عثرات اخلاق الشعوب قیامُ

واذا الاخلاق کانت سُلّما — نالت النجم ید الملتمس

واذا اصیب القوم فی اخلاقهم — فأُقم علیهم ماتما وعویلا

(قوموں کے اخلاق اگر باقی ہوں تو وہ بھی باقی رہیں گی اور جب اخلاق ختم ہو جائیں گے تو خود قوم ختم ہو جائیگی)

(لوگوں کا سدھار اخلاق ہی سے ہو سکتا ہے، جب اخلاق ختم ہو جائے گا تو لوگ خود بگڑ جائیں گے)

(تلوار کی ضرب کے بعد انسان سنبھل سکتا ہے، لیکن اخلاقی لغزش کے بعد سنبھلنا ممکن نہیں)

(اخلاق کے سہارے انسان ستاروں کو چھو سکتا ہے)

(اخلاقی لحاظ سے جب قوم میں زوال آجائے تو اس پر ماتم و نوحہ کرو)

اسلام میں غرباء و امراء کو مساوی حقوق حاصل ہیں، کسی طبقہ کو دوسرے پر کوئی فضیلت یا ترجیح نہیں ہے:

بک یا ابن عبد اللہ قامت سمحۃ — بالحق من ملل الہدیٰ غراء

فوسمت بعدک للعباد حکومۃ — لا سوقۃ فیہا ولا امراء

اللہ فوق الخلق فیہا وحدہ — والناس تحت لوائہا أکفاء

أنصفت اہل الفقر من اہل الغنی — فالکل فی حق الحیاۃ سواء

(اے رسول ﷺ آپ ہی کے ذریعہ شریعت مطہرہ نے حق کو غالب و قائم کیا
آپ نے انسان کے لیے ایسی حکومت قائم کی جس میں امیر و غریب کا فرق مٹا دیا گیا
اس کی تعلیم ہے کہ اللہ واحد اور سب پر بالا ہے اور لوگ شریعت کے جھنڈے تلے مجبور یا مطیع ہیں
آپ نے الدار و غریب کے درمیان انصاف کیا، چنانچہ سب کو برابر جینے کا حق حاصل ہے)

مذہبی شاعری کے مختلف ادوار شوقی کے اسلامی اشعار کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے،
پہلا دور جلا وطنی کے قبل کا، دوسرا دور، جلا وطنی کا اور تیسرا دور وطن آنے کے بعد کا،
ان میں ہر دور پر مختصر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

پہلا دور شوقی نے جب ہوش سنبھالا اس زمانہ کی اسلامی دنیا میں دین کا بول بالا تھا،
اور مسلمان دین کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، مسلمان حکومتیں اور عوام دینی رشتہ
میں جڑے ہوئے تھے، ان کی قیادت و سربراہی عثمانی خلیفہ کرتے تھے، ان کی کوشش تھی
کہ سارے مسلمان اسلامی اخوت کے رشتہ میں منسلک ہوجائیں، شوقی اس جذبہ کو قدر و منزلت
کی نگاہ سے دیکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے خلیفہ کی تعریف میں قصیدے لکھے، انکے نزدیک
اسلام اور مسلمانوں کو اگر کہیں پناہ مل سکتی تھی تو وہ خلیفہ کی شخصیت تھی، اس کی مدح
میں لکھتے ہیں:

رضی المسلمون والاسلام — فرع عثمان دم فداک الدوام

وضع الشرق فی یدیک یدیہ — وأتت من حماتہ الاقسام

غیر غاو او خائن او حسود — برئت من اولئک الاحلام

(تجھ سے اسلام اور مسلمان راضی ہیں، عثمان کی نسل! تو ہمیشہ باقی رہے اور دوام تجھ پر فدا ہو
مشرق نے تمھارے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیا ہے، اور اس کے سربراہوں نے قسمیں کھائی ہیں
تجھ میں نہ تو بے راہ روی ہے نہ خیانت، نہ حسد، تو اس طرح کے نقائص سے بری ہے)
۱۳۱۴ھ کی جنگ میں یونانیوں پر جب ترکوں کو فتح حاصل ہوئی تو شوقی نے سلطان کی
مدح میں ایک پر زور قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

بحمد اللہ رب العالمینا — وحمدک یا امیر المؤمنینا

لقینا فی عدوک ما لقینا — لقینا الفتح والنصر المبینا

جمعت لنا الممالک والشعوبا — وکانت فی سیاستہا ضروبا

بنی عثمان انا قد قدرنا — فتوحکم الکبار وقد شکرنا

سالنا اللہ نصرا فانتصرنا — بکم واللہ خیر الناصرینا

(خدا کی حمد جو رب العالمین ہے۔ اور تمھاری تعریف اے امیر المومنین!
دشمنوں کے مقابلہ میں اللہ کے فضل اور آپ کی بدولت ہمیں کھلی ہوئی فتح حاصل ہوئی
تو نے ان مختلف ممالک و اقوام کو جمع کر دیا جن کی سیاست باہم مختلف تھی
آل عثمان! ہمیں تمھاری فتوحات کا اندازہ ہے اور ہم تمھارے شکر گذار ہیں
اللہ تعالیٰ سے ہم نے فتح کی دعا کی تھی اور تمھاری بدولت ہمیں فتح حاصل ہوئی، خدا بہترین مددگار ہے)
شوقی عثمانی سلاطین کو مسلمانوں کا مذہبی خلیفہ اور ان کی اطاعت ضروری سمجھتے تھے،
علامہ شکیب ارسلان لکھتے ہیں: سلطان عبد الحمید کی ذات سے شوقی کو کوئی خاص تعلق نہیں تھا

صرف منصب خلافت پر فائز ہونے کی وجہ سے شوقی اور عام مسلمانوں کے دلوں میں ان کی شخصیت کا احترام تھا، چنانچہ سلطان عبد الحمید کے بعد جب ان کے بھائی محمد رشاد محمد پنجم کے نام سے تخت خلافت پر بیٹھے تو شوقی نے ان کی بھی مدح لکھی، کیونکہ ان کی نظر میں اسی منصب کی حیثیت اہم تھی۔

شوقی نے پہلے دور میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں تین قصیدے لکھے، پہلا "نہج البردہ" جس میں البوصیری کا تتبع کیا ہے۔ دوسرا ہمزیہ اس میں بھی البوصیری کے ہمزیہ قصیدہ کا تتبع کیا ہے اور تیسرا ذکری المولد جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کے سلسلہ میں مسلمانوں کو آپ کی پاکیزہ تعلیمات پر عمل کرنے کی ترغیب دی ہے، اس دور میں شوقی نے زیادہ تر دوسرے شعراء کا تتبع کیا ہے، شاعر اور جس قصیدہ کا وہ تتبع کرتے ہیں، اس سے پوری طرح متاثر ہوتے ہیں اور ان کا یہ تاثر ان کے قصائد میں نمایاں نظر آتا ہے، "صدی الحرب" کے عنوان سے جو قصیدہ لکھا ہے اس کا مطلع ہے:

بسیفک یعلو الحق والحق اغلب — وینصر دین اللہ ایان تضرب

متنبی نے کافور کی مدح میں جو قصیدہ لکھا تھا اور جس کا مطلع تھا:

أغالب فیک الشوق والشوق أغلب — واعجب من ذا الھجر والوصل اعجب

یہ قصیدہ اس کے تتبع میں لکھا گیا ہے، شوقی نے بھی سلطان عبد الحمید کی مدح میں ٹھیک وہی طریقہ اختیار کیا ہے، جو متنبی کا ہے۔

دوسرا دور | جلاوطنی کے بعد سے شوقی کی مذہبی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، جلاوطنی کا زمانہ کاٹنے کے لیے شوقی جب اندلس آئے تو انھیں اسلامی اتحاد سے مایوسی ہو چکی تھی، کیونکہ جنگ عظیم میں عربوں نے ترکی حکومت کا ساتھ نہیں دیا تھا، اس زمانہ میں شوقی نے جو اشعار کہے

---

۵ شکیب ارسلان: شوقی او صداقۃ اربعین سنۃ ص ۲۹ ۔

ان میں ایک طرف مصر اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ غیر معمولی لگاؤ پایا جاتا ہے، تو دوسری طرف اندلس میں اسلامی آثار کو دیکھ کر وہ خون کے آنسو روتے ہیں، اور اپنے اسلاف کی گذشتہ عظمت و سطوت کا تذکرہ کرتے ہیں، اس دور میں انھوں نے قلعۃ الحمراء، دول العرب وعظماء الاسلام اور صقر قریش وغیرہ نظمیں لکھیں، اندلس میں مسلمان سلاطین کے آثار نے شوقی کے جذبات کو ابھار دیا تھا، اور وہ ان آثار پر آنسو بہا کر مسلمانوں کے خوابیدہ جذبات کو بیدار اور ان کے عزائم کو بلند کرنا چاہتے تھے۔

قرطبہ کے اسلامی آثار جہاں کسی زمانہ میں مسلمانوں کے دم سے رونق اور بہار تھی اب سنسان نظر آرہے تھے، انکی گذشتہ عظمت و سطوت کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا، ایک شعر میں کہتے ہیں:

قریۃ لا تعد فی الارض کانت — تمسک الارض ان تمید وتتر

واذا الدار ما بھا من انیس — واذا القوم ما لھم من مجس

(جو شہر آج بے حیثیت بنا ہوا ہے وہی کل تک زمین کے لیے باعث استقرار و سکون تھا اب اس گھر میں نہ تو کوئی انیس ہے اور نہ گھر والوں کو کوئی جانتا ہے)

قصیدہ کے آخر میں اندلس سے مسلمانوں کے خاتمہ کا نقشہ بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے

خرج القوم فی کتائب صم — عن حفاظ کموکب الدفن خرس

رکبوا بالبحار نعشا وکانت — تحت آبائھم ھی العرش امس

(یہاں سے مسلمان خاموش دستوں میں اس طرح نکلے جیسے لوگ جنازہ لیکر چلتے ہیں جہازوں پر وہ نعش کی صورت میں سوار ہوئے، حالانکہ انہی جہازوں پر انکے اجداد شاہانہ شان سے آئے تھے)

ان آثار اور یہاں کے سلاطین کے انجام سے عبرت اندوزی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

حسبهم هذه الطلول عظات   من حديد على الدهور ودرس

واذا فاتك التفات الى الما ...... ضي فقد غاب عنك وجه التأسي

(ان کھنڈرات میں مسلمانوں کے لیے زبردست عبرت کا سامان موجود ہے

جب کوئی قوم ماضی کو فراموش کر دیتی ہے، تو وہ سلف کی پیروی میں ناکام ہو جاتی ہے)

اسی جلا وطنی کے زمانہ میں "دول العرب وعظماء الاسلام" کے عنوان سے اپنا مشہور قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے:

الحمد لله القديم الباقي   ذي العرش والسبع العلا الطباق

اندلس کے اسلامی آثار کو دیکھنے کے بعد شوقی کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ کاش مسلمانوں کے اقبال کا زمانہ پھر لوٹ آئے اور ان کی کھوئی ہوئی عزت انھیں واپس مل جائے، مشاہیر اسلام کے کارناموں کو اسی غرض سے انھوں نے اس قصیدہ میں نمایاں کیا ہے کہ موجودہ نسل میں اپنے کھوئے ہوئے مقام کو واپس لینے کا جذبہ پیدا ہو۔

حتى اراد الله ان نظمت   من سير الرجال ما استعظمت

علماً بما يبعث في الاحداث   غرائب الاعمال والاحداث

(میں نے مشیت الٰہی سے مشاہیر کی سیرت کو نظم کا جامہ پہنایا ہے

کیونکہ واقعات سے آدمی بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہے)

تیسرا دور ۱۹۱۹ء کے اخیر میں جب شوقی جلا وطنی کے دن کاٹ کر وطن واپس آئے تو ان کی مذہبی شاعری کا تیسرا دور شروع ہوا، اندلس سے واپسی کے بعد شوقی نے دیکھا کہ مصر کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہے. پہلے ساری عظمت اور بڑائی خلیفہ کی ذات میں مرکوز تھی، عوام کی اسکے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہ تھی، لیکن اب عوام کا زمانہ تھا، خلیفہ بدل سکتا ہے لیکن عوام اور

ان کے حوصلے ہمیشہ باقی رہیں گے، ان حالات کو دیکھکر شوقی نے بھی اپنی شاعری کا رخ قصر شاہی سے عوام کی طرف پھیر دیا اور مسلمان عوام اور نوجوانوں کو اپنا مخاطب بنایا۔

۱۹۲۴ء میں انگریزی عدالت سے سزا پانے والے مصری جب قید سے چھوٹ کر واپس آئے تو شوقی نے گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کیا، ان کی کوششوں کو سراہا اور انھیں ملک کی آزادی کیلیے جد وجہد کا نیا پیغام دیا،

يا مصر اشبال العرين ترعرعت   ومشت اليك من السجون اسودا

طلبوا الجلاء على الجهاد مثوبة   لم يطلبوا اجر الجهاد زهيدا

يا فتية النيل السعيد خذوا المدى   واستانفوا نفس الجهاد مديدا

انتم غدا اهل الامور وانما   كنا عليكم في الامور وفودا

فابنوا على اسس الزمان وروحه   ركن الحضارة باذخا وشديدا

اني نظرت الى الشعوب فلم اجد   كالجهل داء للشعوب مبيدا

(اے مصر الجھار کے شیر قید خانوں سے نکل کر تیرے پاس پہنچ گئے

جہاد کا ثواب انھوں نے سامراج کی جلا وطنی کی صورت میں طلب کیا اور یہ اجر مناسب ہے

اے وادی نیل کے جوانو! ہتھیار سے مسلح ہو کر اپنا جہاد پھر شروع کرو

کل ملک کی باگ ڈور تمھارے ہاتھ میں ہوگی اور ہم تمھارے پیغامبر

زمانہ کے حالات کے مطابق تہذیب و تمدن کی مضبوط عمارت تعمیر کرو

قوموں کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جہالت سے زیادہ مہلک کوئی بیماری نہیں ہے)[1]

اس دور کے اشعار کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا رخ خلیفہ کے بجائے عوام کی طرف ہو گیا اور ان کی شاعری عوام کے جذبات کی ترجمان بن گئی، اس دور میں شوقی نے جو مرثیے لکھے

[1] شوقیات ج ۱ ص ۱۳۲

ان میں بھی عوام ہی کی طرف توجہ دی اور اس کو حوصلہ بلند رکھنے کا پیغام سنایا طرابلس کے لیڈر "عمر المختار" کو اٹلی نے پھانسی کی سزا دی تھی، ۱۹۳۱ء میں شوقی نے ان کا مرثیہ لکھا، اس میں عوام کو خطاب کرتے ہوئے ان کی اس طرح حوصلہ افزائی کی

یا ایھا الشعب القریب اسامع — فاصوغ فی عمر الشہید رثاء

ذھب الزعیم وانت باق خالد — فانقد رجالک واختر الزعماء

(لوگو! شہید عمر کے بارے میں میرا مرثیہ سنو

لیڈر چلا گیا لیکن تم لوگ باقی رہوگے، اپنے لوگوں میں سے کسی کو پرکھکر اپنا رہنما منتخب کرلو[1])

اس دور کی شاعری میں اگرچہ شوقی نے اسلامی اتحاد کی دعوت کو نہیں دہرایا، کیونکہ خلافت کا نظام ختم ہونے کے بعد قوم پرستی کا دور شروع ہوگیا تھا، مگر شوقی اپنے پرانے نظریہ پر قائم تھے، جس کا اظہار انھوں نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔

مذہبی اشعار کے اس مختصر جائزہ سے یہ ظاہر ہوگا کہ شوقی سچے اور مخلص اسلامی شاعر تھے مسلمانوں کے مسائل اور اسلامی تعلیمات سے انھیں محبت تھی، اور وہ اسلامی بنیادوں پر مسلمانوں کی اصلاح چاہتے تھے ان کے دل میں ان کے لیے تڑپ تھی، علامہ اقبال کے علاوہ کوئی دوسرا شاعر ایسا نہیں نظر آتا جس نے اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اسلامی مسائل پر اظہار خیال کیا ہو، خود شوقی کو بھی اسکا احساس تھا، ایک شعر میں کہتے ہیں:

کان شعری الغناء فی فرحۃ الشرق — وکان العزاء فی احزانہ

(مشرق کی خوشی میں میرے اشعار نغمہ طرب اور اس کے غم کے وقت باعث تسلی ہوتے ہیں)

---

[1] الشوقیات ج ۳ ص ۱۷

کلکتہ کی ایران سوسائٹی کی سلور جوبلی

از پروفیسر مسعود حسن، صدر شعبۂ عربی مولانا آزاد کالج کلکتہ

ملک کی مشہور علمی، ادبی اور ثقافتی انجمن ایران سوسائٹی کلکتہ کی تاسیس ۲۹ اگست ۱۹۴۴ء کو ہوئی تھی، اس مدت میں اس نے جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اس نے جو شہرت حاصل کی ہے، ان سب کی وجہ سے وہ بجا طور پر اسکی مستحق تھی کہ اس کی ۲۵ ویں سالگرہ کی تقریب اسکے شایان شان منائی جائے، اس کے محترم بانی اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد اسحٰق نے اس کی تیاری شروع کردی تھی، اور اس کے سلور جوبلی سووینیر کی تیاری میں مشغول تھے کہ اچانک قلب کی حرکت بند ہوجانے کی وجہ سے عالم جاودانی کو سدھارے، خداوند تعالیٰ انکی تربت پر رحمت کے پھول برسائے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے — سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ڈاکٹر صاحب مرحوم سوسائٹی کے رُوح رواں اور معمار اعظم تھے، انھوں نے اس کو اپنے خون جگر سے پروان چڑھایا تھا، وہ اپنی صحت کو خطرے میں ڈالکر دن رات اس کے کاموں میں لگے رہتے تھے، ان کی وفات سے سوسائٹی کے کارکنوں کو صدمۂ عظیم پہنچا، ان کی رُوح کی تسکین کی خاطر سوسائٹی کی سلور جوبلی کی تقریب اور بھی ضروری سمجھی گئی، اس کے لیے ۷، ۸، ۹ مارچ ۱۹۷۰ء کی تاریخیں مقرر ہوئیں، سلور جوبلی سووینیر کی ترتیب کا بڑا حصہ ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم اپنی زندگی میں انجام دے چکے تھے، اسکی تکمیل و طباعت کے مختلف مرحلے سوسائٹی کے جواں سال و جواں ہمت نائب صدر جناب خواجہ محمد یوسف نے طے کیے، وہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی میں ان کے دست و بازو تھے، اور اب ان کی وفات کے بعد سوسائٹی کے قلب و جگر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں،

۱۳ مارچ کو ۶ ½ بجے شام یہ تقریب شروع ہوئی، اس کے لیے میدان میں ایک شاندار شامیانہ نصب کیا گیا تھا جو برقی قمقموں، پھول کے ہاروں اور رنگین پردوں سے آراستہ تھا، سوسائٹی کے اراکین کلکتہ کے تعلیمی اداروں کے اساتذہ، اعلیٰ سرکاری افسروں مجلس قانون ساز کے ممبروں اور دوسرے معززین کے علاوہ بیرونِ کلکتہ سے نمایندوں کی اچھی خاصی جماعت شرکت کے لیے آئی تھی جن میں گجرات سے پروفیسر کاؤس جی ڈاور، مدراس سے ڈاکٹر حیدر علی خاں، پٹنہ سے پروفیسر سید حسن، پروفیسر علی حیدر، بھاگلپور سے پروفیسر صدر الدین احمد اور دہلی سے ڈاکٹر حکیم الدین قریشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایران سوسائٹی کا یہ پہلا اجتماع تھا جس میں ڈاکٹر صاحب موجود نہیں تھے، اسوقت انکے عقیدتمندوں کی آنکھیں پُر نم ہو گئیں۔

آج لیکن ہمنوا! سارا چمن ماتم میں ہے   شمع روشن بجھ گئی بزم سخن ماتم میں ہے

تقدس مآب ڈاکٹر لک ڈا ساڈے مل ہندوستان، پاکستان اور سیلون کے میٹرو پولیٹن ہی تشریف لائے، تقدس مآب کو جلسے اور اس کی نمائش کے افتتاح کرنے کی زحمت دی گئی تھی۔ جناب محمد علی اکبر کاشانی نے جو نہ صرف سوسائٹی کے سابق اور موجودہ صدر بلکہ اسکے محسن اعظم بھی ہیں، تقدس مآب میٹرو پولیٹن اور تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا، ڈاکٹر محمد اسحٰق صاحب کے دست راست جناب عبدالمجید عثمانی صاحب نے جو ان دنوں قائم مقام جنرل سکریٹری ہیں، اختصار کے ساتھ سوسائٹی کی تاریخ اور خدمات پر روشنی ڈالی، اسکے بعد سب سے پہلے پروفیسر ڈاور نے ایک طویل فاضلانہ تقریر کی جس میں انھوں نے ہندوستان اور ایران کے قدیم ادبی و ثقافتی تعلقات پر روشنی ڈالی، پھر ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ نے جو سوسائٹی کے سرگرم رکن اور نائب صدر رہ چکے ہیں، اپنے خاص انداز میں ایک پر جوش تقریر کی، ریاست کے دو مشہور اشتراکی لیڈر اور مجلس قانون ساز کے رکن سید ابو المنصور حبیب اللہ اور ڈاکٹر اے، ایم، او، غنی کی تقریریں بھی دلچسپی سے سنی گئیں، میٹرو پولیٹن کا فصیح شگفتہ اور دلنشین خطبہ سب کو پسند آیا، انھوں نے ہمسایہ ملکوں کی زبانوں کے سیکھنے اور ان سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی اہمیت پر زور دیا، اسکے بعد جناب صدر کی تحریک پر ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کی یاد میں خاموشی کا ایک منٹ کا وقفہ ہوا، اس رسم کو تمام

حاضرین جلسہ نے تعظیماً کھڑے ہو کر ادا کیا، مسٹر پولا دیان پرنسپل آرمینیس کالج نے جو سوسائٹی کے سابق صدر رہ چکے ہیں اور موجودہ خازن ہیں، مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، ایک مختصر سی ضیافت کے بعد افتتاحیہ اجلاس تقریباً ۹ بجے ختم ہوا، اب تقدس مآب میٹرو پولیٹن پنڈال سے سوسائٹی کی عمارت میں تشریف لے گئے اور وہاں انھوں نے علمی نمائش کے افتتاح کی رسم انجام دی، یہ نمائش سوسائٹی کے ہال میں کی گئی تھی، ایک میز پر سوسائٹی کی تقریباً ڈیڑھ درجن مطبوعات قرینہ سے رکھی گئی تھیں، دوسری میز پر اسکے سہ ماہی رسالہ انڈو ایرانیکا کی جلدیں سجی ہوئی تھیں، جو ۱۹۴۶ء سے باقاعدہ جاری ہے، ایک طرف جناب ڈاکٹر اسحٰق مرحوم کی تصنیفات خراج عقیدت وصول کر رہی تھیں، دوسری جانب فارسی کی قلمی اور نادر کتابیں جو ایشیاٹک سوسائٹی اور انڈین میوزیم سے مستعار لی گئی تھیں، اصحاب ذوق کی ضیافت کا سامان پیش کر رہی تھیں، ایرانی آرٹ سے متعلق بہت سی تصویریں دیواروں پر آویزاں کی گئی تھیں، فارسی رسائل و جرائد کا ایک ذخیرہ جو ایران سوسائٹی کی ملکیت ہے، توجہ کا مرکز بنا رہا، نمائش کے ایک حصہ میں رکھی ہوئی کچھ مطبوعات فارسی ادب کے سلسلہ میں بنگال کی خدمات کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

۱۴ مارچ کی شام کو سلور جوبلی کا عام اجلاس تھا، یہ جشن کی سب سے بڑی تقریب تھی، اس روز شامیانہ کی تزئین و آرائش میں پہلے سے زیادہ اہتمام کیا گیا تھا، عزت مآب شری پی بی مکرجی قائم مقام چیف جسٹس مغربی بنگال جو اس اجلاس کی صدارت فرمانے والے تھے، سب سے پہلے تشریف لائے، پھر ہز اکسلنسی آقائی امیر تیمور سفیر شاہنشاہی ایران رونق افروز ہوئے جو اس اجلاس کے مہمان خصوصی تھے، انھوں نے صرف اسی جشن میں شرکت فرمانے کے لیے دہلی سے کلکتہ کے سفر کی زحمت گوارا کی تھی، سب کے آخر میں ہز اکسلنسی شری شانتی سروپ دھون گورنر مغربی بنگال کی تشریف آوری ہوئی، وہ اپنی مختلف مشغولیتوں کے باوجود تقریب کے افتتاح کے لیے تشریف فرما ہوئے تھے جناب علی اکبر کاشانی اور جناب خواجہ محمد یوسف کی قیادت میں سوسائٹی کے عہدیداروں نے پنڈال کے پھاٹک پر ان تینوں معزز مہمانوں کا پرتپاک خیر مقدم کیا، کارروائی ۶ ½ بجے شروع ہوئی، آرمینین کالج کے طلبہ اور طالبات نے ہندی اور ایرانی ترانے موسیقی کے درمیان خوش الحانی سے گائے، استقبالیہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے کاشانی صاحب نے

اپنا سپاسنامہ پڑھا، ایران و ہند کے قدیم ثقافتی رشتہ کا ذکر کرتے ہوئے اسکا اعتراف کیا کہ ہندستان اپنی لمبی تاریخ کے ہر دور میں تہذیب و ثقافت کے ہر شعبہ میں ایران کا ممنون رہا ہے۔ انھوں نے فارسی علم و ادب سے بنگال کی دلچسپی کا بھی ذکر فرمایا اور حافظ کا یہ مشہور شعر پڑھا جسے انھوں نے بنگال کے فرمانروا سلطان غیاث الدین کو لکھکر بھیجا تھا:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

خواجہ محمد یوسف صاحب عثمانی نے نائب صدر جمہوریہ ہند شری جی۔ ایس۔ پاٹھک، وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اسپیکر لوک سبھا ڈاکٹر جی۔ ایس۔ ڈھلون، اسپیکر مغربی بنگال شری بجوئے کمال بنرجی، میئر کلکتہ کارپوریشن شری پرساتنا کمار سور اور حیدرآباد کے مشہور مورخ اور ماہر تعلیم پروفیسر ہارون خاں شروانی کے پیغامات تہنیت پڑھکر سنائے، دارالمصنفین کی جانب سے مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے جو پیغام بذریعہ تار بھیجا تھا اسے بھی سنایا گیا، گورنر موصوف کا خطبہ نہایت اہم، مفید اور پر از معلومات تھا، انھوں نے ہندوستان اور ایران کے باہمی تعلقات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ "ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ یہ رابطہ ختم ہو گیا تھا، شکر ہے کہ دونوں ملکوں کی مکمل آزادی کے بعد یہ از سر نو شروع ہو گیا ہے۔" ہز اکسلنسی کے مندرجہ ذیل جملے خاص طور پر بڑی توجہ سے سنے گئے۔

"ایرانیوں کو یہ فخر حاصل ہے اور بجا طور پر فخر حاصل ہے کہ رگ وید کی پہلی آیت ایران کی سرزمین میں نازل ہوئی۔ ..... ہمارے ملک کا سب سے قدیم نام نہ بھارت ہے اور نہ آریہ ورت بلکہ "ہند" ہے، جو ہمیں ایران نے عطا کیا ہے۔ ..... فارسی ادب اپنی بیشمار دلچسپ حکایات کی وجہ سے مشہور ہے، آپ انھیں اصل فارسی زبان میں پڑھیے اور ان کا لطف اٹھائیے۔ ..... مجھے بہت سی فارسی کہانیاں یاد ہیں۔ ..... میں پیشنگوئی کر سکتا ہوں کہ یہ عظیم الشان فارسی زبان ایک دن وسط ایشیا، تاجکستان، ازبکستان، آذربائیجان، ایران، افغانستان اور ہندوستان کے درمیان رابطہ کی زبان بن جائیگی۔ ..... فارسی دنیا کی سب سے خوبصورت زبان ہے۔ ..... ایک مرتبہ میں روس گیا تھا اور وہاں مجھے اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں باتیں کرنے کا موقع ملا تھا، اور اسی وقت مجھے پہلی بار اس قدیم زبان کی بین الاقوامی اہمیت کا اندازہ ہوا تھا...."

جناب خلیل الرحمن ڈپٹی مجسٹریٹ نے اپنا فارسی قصیدہ پڑھا جو اس موقع کے لیے لکھا گیا تھا۔ اسکے بعد کاشانی صاحب نے سلور جوبلی کے موقع پر شائع ہونے والے مجموعۂ مقالات کا ایک ایک نسخہ گورنر مغربی بنگال، سفیر ایران، اور قائم مقام چیف جسٹس کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کیا، یہ مجموعہ ۴۰۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اور ایک مختصر دیباچہ، ایران سوسائٹی کے تفصیلی تعارف اور ۲۵ تحقیقاتی علمی مقالات پر مشتمل ہے، مقالات کی فہرست درج ذیل ہے:-

(حصہ انگریزی) ۱- فرخ بیگ کی بنائی ہوئی ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تصویر، از پروفیسر نذیر احمد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۲) ایک یہودی فارسی مناظرہ، از پروفیسر جے پی آسمسن، کوپن ہاگن یونیورسٹی (۳) ہندوستان میں ایران سے آنے والے آرمنی، از مسز اینی جیسل کلکتہ (۴) تصوف کا سنہرا رشتہ، از پروفیسر فردونجی ڈاور، گجرات یونیورسٹی۔ (۵) نظیری کی گنج معانی، از ڈاکٹر ضیاء الدین عبدالحی ڈیسائی، ارکیالوجیکل سروے آف انڈیا۔ (۶) ترک افاغنہ کے عہد میں عربی و فارسی ادبیات کی ترقی میں بنگال کا حصہ، از ڈاکٹر جیمن موہن دت، کلکتہ یونیورسٹی، (۷) جدید فارسی گرامر از ڈاکٹر ولہیم ایلرس، مغربی جرمنی (۸) محمد عارف شیدا، از ڈاکٹر عبدالحمید فاروقی، گجرات کالج احمد آباد (۹) خراسان میں عربی زبان، از پروفیسر رچرڈ این فرائی، ہارورڈ یونیورسٹی (۱۰) ایک ہندستانی حکمران اور انقلاب فرانس، از پروفیسر محب الحسن، جامعہ ملیہ دہلی، (۱۱) فارسی شاعری کا بابا آدم، رودکی، از ڈاکٹر محمد اسحٰق کلکتہ (۱۲) جیمز موریر اور حاجی بابا اصفہانی، از ڈاکٹر حسن جوادی (۱۳) منوچہر کی رائے میں ایک کامل خدا پرست کا تصور از پروفیسر ایم ایف کانگا (۱۴) گمشدہ پہلوی ادب کی جھلکیاں، از جمشید کاؤس جی کٹراک (۱۵) ۱۹۰۵-۱۱ء کے دوران ایران کا دستوری انقلاب، از پروفیسر نکی آر کڈی، (۱۶) قدیم ایران سے متعلق گیارہویں صدی کی ایک عربی اندلسی تصنیف کا ایک باب، از ڈاکٹر محمد صابر خاں کلکتہ، (۱۷) محمد تقی بہار مصور فطرت کی حیثیت سے از پروفیسر فرانسس زک اچالسکی، (۱۸) پارسیوں کی سنسکرت تحریریں، از ڈاکٹر ایچ کے مرزا (۱۹) رودکی کے اشعار کا ایک جعلی مخطوطہ، از پروفیسر عبدالغنی مرزوئف (۲۰) فارسی زبان کے ہندی الاصل شعراء، از مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن دارالمصنفین اعظم گڈھ (۲۱) مرلک میں پائے گئے ایرانی ہل کے نمونے، از ڈاکٹر ارمس سیلوئش

(۲۲) قدیم فارسی میں مسیحی تحریر کا ایک کتبہ از ریورینڈ الف نورمن شارپ (۲۳) قطب شاہی حکومت کے آخری دور کے ثقافتی حالات، از پروفیسر ہارون خان شروانی حیدرآباد۔

فارسی و عربی حصہ | (۲۴) ملک الشعراء بہار، از پروفیسر شاہ اسلام شاہ محمد وف (۲۵) مسألۃ صفات الذاکرین والمتفکرین للسلمی۔ از مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی کلکتہ۔

دوسری تقریر ہز اکسلنسی آقائی امیر تیمور کی تھی انھوں نے انگریزی میں بلیغ اور مؤثر انداز میں ایک طویل تقریر کی، آپ نے پہلے ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کی علمی و ادبی صلاحیتوں اور انکی ایران دوستی اور فارسی ادبیات سے غیر معمولی شغف کی تعریف کی، پھر ایران سوسائٹی کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اسے اپنا خراج تحسین عطا کیا، ایران و ہند کے قدیم روابط کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ہندستان کی قیمتی خدمات کا اعتراف کیا، پھر جدید ایران کی علمی، ادبی، تعلیمی اور اقتصادی ترقیوں کی تفصیلات پیش کیں، اس کے بعد قائم مقام جنرل سکریٹری نے لکھی ہوئی رپورٹ پیش کی جس میں انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے سوسائٹی کی پچیس ۲۵ سالہ اہم کارگذاریوں کی تفصیل بتائی، پھر دو مختصر تقریریں مسٹر جسٹس تعلقدار اور مسٹر مودک سابق ممبر انڈین سوشل سروس کی ہوئیں، اول الذکر نے فارسی ادب کے شاہکاروں کو بنگلہ زبان میں منتقل کرنے کی طرف توجہ دلائی، موخر الذکر کئی موقعوں پر سوسائٹی کے صدر رہ چکے ہیں، اور شروع سے اسکی سرپرستی فرما رہے ہیں، ان کی تقریر سوسائٹی کی محبت اور سوسائٹی کے بانی سے مخلصانہ عقیدت کے جذبات سے لبریز تھی۔

جناب خواجہ محمد یوسف صاحب کی درخواست پر جناب صدر تقریر کے لیے کھڑے ہوئے، انھوں نے مختصر طور پر لیکن بڑے خلوص سے کارکنان سوسائٹی کا شکریہ ادا کیا، اور انھیں جشن سیمیں کی کامیابی پر دلی مبارکباد دی، فارسی زبان اور ایران سے اپنی محبت کا اظہار کرنے کے بعد انھوں نے فرمایا:

"...... ہندستان ایران کی اس سرزمین کو ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھے گا جو گلستاں و بوستاں اور گل و بلبل کی داستان محبت کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ایران عشق، محبت، علم اور فنون لطیفہ کی جنت ارضی ہے......

مجھے امید ہے کہ ایران سوسائٹی دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت اور دونوں ملکوں کی زبان، مذہب، فلسفہ، تہذیب اور سب سے بڑھکر ان دونوں کی انسان دوستی کو نشوونما دینے کی ہر ممکن سعی کرے گی"۔

ایران سوسائٹی کی ہر بڑی تقریب میں جناب صدر اور حاضرین کا شکریہ ادا کرنے کے لیے قرعۂ فال ہمیشہ خواجہ محمد یوسف صاحب کے نام نکلتا ہے، چنانچہ اس موقع پر بھی انھوں نے یہ فرض بڑے سلیقہ سے انجام دیا، اس سلسلے میں انھوں نے بنگال میں مشرقی علوم کی اہم خدمات کی طرف جو اشارے کیے وہ بہت مفید اور برمحل تھے۔

مسٹر کاشانی صدر سوسائٹی کی طرف سے ایک مختصر سی ضیافت کے بعد یہ اجلاس تقریباً دس بجے شب کو ختم ہوا۔

تیسرے دن ۸ مارچ کو جشن سیمیں کی آخری تقریبات تھیں، اور شام کے علاوہ دن کا پروگرام بھی تھا، سب سے پہلے ۹ بجے صبح کو سوسائٹی کے ہال میں مقالہ خوانی کا جلسہ عالیجناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب کی صدارت میں شروع ہوا، ڈاکٹر صاحب موصوف اپنی پیرانہ سالی اور بے شمار مصروفیتوں کے باوجود تشریف لائے، خواجہ محمد یوسف صاحب نے اپنی تعارفی تقریر میں بجا طور پر کہا کہ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب ہندستان میں علوم اسلامیہ کے ماہرین کی صف میں ایک بڑی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ اسکے بعد حسب ذیل مقالات پڑھے گئے، افسوس ہے کہ وقت کی قلت کی بنا پر ان پر بحث کے لیے موقع نہیں نکالا جا سکا،

(۱) قدیم ایران (انگریزی) از پروفیسر فیروز کاؤس جی داور، احمد آباد (۲) پہلوی دور حکومت میں ایران کا تعلیمی نظام (فارسی) از آقائی محمد مہدی شیخانی، تہران (۳) بھاگلپور کی تاریخ (انگریزی) از پروفیسر صدر الدین احمد صاحب بھاگلپور (۴) فارسی در تامل ناڈو (فارسی) از پروفیسر حیدر علی خان صاحب مدراس (۵) ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کے متعلق میرے تاثرات (انگریزی) از پروفیسر سید حسن صاحب پٹنہ (۶) گیریش چندر سین یکے از فضلاء بزرگ عربی و فارسی در کلکتہ (فارسی) از ڈاکٹر عطا کریم برق صاحب کلکتہ (۷) سیر تحول روابط ایران در عصر حاضر (فارسی) از ڈاکٹر حکیم الدین صاحب دہلی (۸) ڈاکٹر محمد اسحٰق، شمع علم کے پروانہ (انگریزی) از پروفیسر علی حیدر نیر صاحب پٹنہ (۹) تسوید شیراز کا (انگریزی) جناب عبد المجید صاحب کلکتہ۔

مقالات ختم ہونے کے بعد جناب صدر نے اپنے خطبہ میں بالاختصار اسلامی عہد کے روابط کا ذکر کیا جو ہندستان اور ایران کے درمیان پائے جاتے تھے، اور جنھوں نے اسلامی تاریخ و تمدن پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں، انھوں نے فارسی زبان کے چند ادبی محاسن کا ذکر فرمایا اور شعرا کے کلام سے مختلف نمونے پیش کرکے انکی تشریح کی۔

مقالہ خوانی ختم ہونے کے ساتھ ہی سلور جوبلی لنچ کی شاندار ضیافت میں کم و بیش دو سو مہمانوں نے شرکت کی، ہز اکسلنسی آقائے امیر تیمور سفیر ایران نے بھی اپنی شرکت سے اس دعوت کو زینت بخشی۔

شام کا پروگرام ادبی و تفریحی تھا، صدارت کے فرائض جناب کاشانی صاحب نے انجام دیے، جلسہ کی کارروائی محترمہ بیگم صغریٰ ہمبروادی، جناب علقمہ شبلی استاد فارسی مدرسہ عالیہ کلکتہ، جناب خلیل الرحمٰن صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ اور حضرت امیر رضا کاظمی سابق ہیڈ ماسٹر مدرسہ عالیہ کی اردو اور فارسی نظموں سے شروع ہوئی جو جشن سیمیں کے لیے لکھی گئی تھیں، سب سے پہلی تقریر پروفیسر ڈاور کی تھی، دوسری تقریر ڈاکٹر حیدر علی صاحب نے کی جو بڑی شستہ، سنجیدہ اور مفید تھی، معزز مقرر نے ہندوستان کی درسگاہوں کے نصاب میں عربی اور فارسی زبانوں کی افادیت پر بڑی مدلل بحث کی، ان کا یہ بیان بھی بہت پسند کیا گیا کہ موت نے ہم سے صرف ڈاکٹر محمد اسحٰق صاحب کا خاکی جسم چھین لیا ہے، ان کی روح اب بھی سوسائٹی کے کاموں میں ہماری نگرانی اور رہنمائی کر رہی ہے اور کرتی رہے گی، آخری تقریر محترمہ لیڈی رانو مکرجی کی تھی، یہ رابندر ناتھ ٹیگور کی عزیز شاگرد رہ چکی ہیں، اور مغربی بنگال میں آرٹ اور دیگر فنون لطیفہ کی بڑی قدردان ہیں، وہ سوسائٹی کی نائب صدر بھی رہ چکی ہیں، انھوں نے اپنی تقریر میں اپنے قیام ایران کے دلکش تاثرات بیان کیے، مہمانوں اور کارکنوں کا شکریہ ادا کرنے کی خدمت مسٹر رستم سکلات نے انجام دی جو سوسائٹی کے بڑے سرگرم رکن ہیں،

اس کے بعد ایک تمثیلی مشاعرہ ہوا، اسٹیج پر سب سے پہلے رودکی، پھر فردوسی، پھر سعدی، پھر پروین اعتصامی نمودار ہوئیں، ان چاروں نے اپنے حالات زندگی انگریزی میں بیان کیے، پھر اپنا منتخب کلام اپنی بیاض سے پڑھ کر سنایا اور رخصت ہوئے، یہ سارے کردار آمینین کالج کے طلبہ اور طالبات نے بڑی کامیابی سے ادا کیے جس کے لیے کالج کے پرنسپل مسٹر یولادیان اور کالج کے فارسی کے استاد آقائی مہدی شیخانی مبارکباد کے مستحق ہیں، اسی کالج کی ایک لڑکی نے کئی فارسی نظمیں اور ایرانی نغمے، ایرانی لہجہ اور ایرانی دھن میں بڑے سلیقہ سے گائے

مطبوعات جدیدہ

تاریخ بیہق ۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ صاحب حسینی، بڑی تقطیع، کاغذ بہتر، کتابت طباعت ٹائپ صفحات .. قیمت ۵ر ناشر دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد،

ابو الحسن علی بن ابو القاسم زید بیہقی چھٹی صدی ہجری کے نامور علماء و مصنفین میں تھے، عربی و فارسی میں انکی متعدد کتابیں ہیں، ان میں تاریخ بیہق (فارسی) زیادہ اہم اور مشہور ہے، یہ بیہق کے متعلق مفید و متنوع معلومات پر مشتمل ہے، اس میں پہلے علم تاریخ کی اہمیت، مختلف ملکوں کے نام اور ان کے متعلق اہم کتب تاریخ کی فہرست ہے، پھر بیہق کے فضائل، وہاں آنے والے صحابہ، اس کی فتح، آب و ہوا، مشہور مقامات، معزز اور حکمراں خاندانوں کا ذکر اور بیہق کے فضلاء و مشاہیر فن، شعرائے فارسی اور دیگر ارباب کمال کے تراجم اور اہم حوادث و وقائع قلمبند کیے ہیں، اس کے تین قلمی نسخوں کا ابتک پتہ چل سکا ہے، جو برٹش میوزیم لندن، برلن اور تاشقند کے کتبخانوں میں ہیں، ان میں برٹش میوزیم کا نسخہ سب سے قدیم، مکمل، صحیح اور خوشخط ہے، کئی سال پہلے ایران کے لائق فاضل احمد بہمنیار نے اسی نسخہ کو اصل اور دوسرے دونوں نسخوں کو مد نظر رکھکر تاریخ بیہق کا مکمل متن تصحیح و مقابلہ کے بعد حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کیا تھا، اس کے شروع میں آقا محمد عبد الوہاب قزوینی کا ایک جامع اور پر از معلومات مقدمہ بھی ہے، اب مشہور فاضل ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی حیدر آبادی نے تینوں قلمی نسخوں کی مدد سے اس کو دوبارہ اڈیٹ کیا ہے، گو اس میں بہمنیار کے مرتبہ نسخہ کی طرح تعلیقات نہیں ہیں لیکن حواشی میں متن کی تصحیح میں بڑی تدقیق و کاوش سے کام لیا گیا ہے، اور آخر میں تین مختلف فہرستیں بھی دی گئی ہیں، سب سے آخر میں مرتب نے بیہقی کے حالات اور کمالات، تاریخ بیہق اور اس کے قلمی نسخوں کے بارہ میں

ایک جامع مقدمہ انگریزی میں لکھا ہے، فاضل مرتب اس علمی و تحقیقی کارنامے پر مبارکباد کے مستحق ہیں، لیکن حیرت ہے کہ انھوں نے کانون کے چاپخانہ سے شائع ہونے والے ایڈیشن کا کوئی ذکر نہیں کیا،

اسلام اور اسکا آئین حکومت
اسلام و اشتراکیت
} مرتبہ جناب غلام محمد صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت غنیمت، صفحات ۴۴ و ۱۲ و ۸۰، قیمت ۸۶ پیسے

و ۵۰ پیسے، پتہ ترکمان گیٹ گڑھ، ڈاکخانہ جامعہ نگر، نئی دہلی، دوسری کتاب کا پتہ: ۲۴، بی

امر کالونی، مارکیٹ، لاجپت نگر، نئی دہلی ۱۴،

پہلے کتابچہ میں اسلام کے آئین حکومت اور دوسرے میں اسلامی اشتراکیت کے خد وخال پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، گو ہر بات قرآنی آیات کی سند سے لکھی گئی ہے لیکن اسلام کے بجائے ترجمانی اشتراکیت کی زیادہ ہو گئی ہے، یہ دونوں کتابچے تمامتر مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی تفسیر ترجمان القرآن (سورہ فاتحہ و توبہ) سے ماخوذ و منقول ہیں، اور اس کو چھپانے کے لیے ایک ہی سلسلۂ بیان میں چند سطریں ایک جگہ سے لی گئی ہیں اور چند سطریں دوسری جگہ سے لیکن تحریر خود بولتی ہے کہ مولانا کا قلم ہے، بعض بعض عبارتیں تو بجنسہ نقل کر دی گئی ہیں، اور بعض میں معمولی تبدیلی کر دی گئی ہے، لیکن دیباچہ یا کتاب کے کسی صفحے پر نہ کہیں مولانا کا نام آنے پایا ہے اور نہ ان کی تفسیر کا حوالہ ہے، جہاں مصنف نے خود اپنی طرف سے کچھ لکھا ہے اور وہ بہت ہی کم ہے، وہاں انھوں نے آیتوں کا غلط سلط مطلب نکالا ہے، خود مولانا کے بیان میں جو غلطیاں ہیں، وہ اس میں بھی رہ گئی ہیں، مولانا کی عبارتیں چونکہ ادھر ادھر سے لے کر ایک سلسلۂ بیان میں جوڑ دی گئی ہیں، اس لیے ان میں کوئی ربط و ترتیب نہیں ہے۔

"ض"

مصنفات مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

۱- اسوۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: ۳/-

۲- اسوۂ صحابہ: (حصہ دوم) " ۴/-

۳- اسوۂ صحابیات: " ۳/-

۴- تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات کی تفصیل: قیمت: ۵/-

۵- حکمائے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندان فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: ۵/-

۶- حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: ۶/-

۷- شعر الہند (حصہ اول) " ۵/-

۸- شعر الہند (حصہ دوم) " ۵/-

۹- انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کی ایک کتاب کا انشا پردازانہ ترجمہ قیمت: ۱/۵۰

۱۰- سیرۃ عمر بن عبد العزیز: (زیر طبع)

۱۱- امام رازی: امام فخر الدین رازی کے سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت ۴/-

۱۲- ابن خلدون: ابن خلدون کے سوانح زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)

۱۳- اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل، اُن کے فلسفۂ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت ۸/-

مقالات عبد السلام

مولانا عبد السلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی تاریخی و تنقیدی و ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل تبصرے بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دار المصنفین کے پیش نظر ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب و شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات ۴۴۶ قیمت: ۷/-

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ